الاؤ



علیم الحق حقی

وہ عید الفطر کا مبارک دن تھا۔

لیکن سیکولر بھارت کے مسلمانوں کے لئے عمومی طور اور مراد آباد کے مسلمانوں کے لئے خصوصی طور پر وہ روزِ قیامت ثابت ہوا۔ کشیدگی تو پہلے سے چل رہی تھی مگر عید کی صبح کینہ پرور مکار اور بزدل ہندوؤں نے حکومت کی سرپرستی میں بربریت کی انتہا کر دی۔ عید کی نماز پڑھنے والے مسلمانوں پر سؤر دھکیل دیئے گئے۔ بھگدڑ مچی تو نماز کے شوق میں آئے ہوئے بے شمار ننھے اور معصوم بچے کچلے گئے۔ اس افراتفری میں اچانک پولیس نے فائر کھول دیا۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اس روز شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد کا تعین بھی نہیں کیا جا سکا۔ اس کے فوراً بعد پورے بھارت میں مسلم کش فسادات شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ پورے بھارت کا چہرہ شہیدوں کے خون سے سیاہ ہو گیا تھا۔

اخبارات کی دو روزہ چھٹی کی وجہ سے پاکستان میں صورتِ حال واضح نہیں تھی مگر ریڈیو اور ٹی وی کی غیرواضح خبروں نے بھی ملک میں کہرام مچا دیا تھا۔ دو دن کے وقفے کے بعد اخبارات آئے تو صورتِ حال بہت سنگین ہو گئی۔ ہر آنکھ خون کے آنسو رو رہی تھی' ہر شخص مشتعل تھا۔

فطری طور پر پاکستان میں اس کا شدید ردِ عمل ہوا۔ ملک بھر میں بھارت کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ بھارتی وزیرِاعظم کے پتلے جلائے گئے' پاکستانی حکومت نے حسب معمول سرکاری سطح پر حکومتِ ہند سے احتجاج کیا اور مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرنے' ان کی نسل کشی کو فوری طور پر روکنے کی اپیل کی۔ حکومت ہند نے بھی معمول کے مطابق فسادات کو بھارت کا اندرونی معاملہ قرار دے کر اس احتجاج کو مسترد کر دیا۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا تھا۔

☆======☆======☆

اس شام منصور نیٹ پریکٹس کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آرہا تھا تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس روز بھی بستی کے چھوٹے بڑے، راستے میں اسے روکتے، سلام کرتے اور حال پوچھتے......... کیا حال ہے منصور بھائی؟ منصور میاں، کیسے ہو؟ وہ اس بستی کا بہت محترم نوجوان تھا۔ علاقے کے بچے اور لڑکے اس پر جان چھڑکتے تھے۔ حد یہ ہے کہ بستی کے معمر اور بڑے لوگوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو اسے منصور بھائی کہہ کر مخاطب کرتے تھے حالانکہ اس کی عمر صرف اکیس سال تھی۔ محلے کی عورتیں بھی اسے اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔

اللہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے، لیکن عزت عام طور پر بے سبب نہیں ملتی۔ منصور اس بستی میں ایک روشن پس منظر رکھتا تھا۔ اس کے مرحوم والد منظور صاحب نے اس بستی کی بڑی خدمت کی تھی۔ پوری بستی ان کی احسان مند تھی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ہندوستان سے آکر اس بستی میں آباد ہوئے تھے۔ اس وقت بمشکل دس جھونپڑیاں تھیں۔ بجلی اور دیگر سہولتوں کا دور دور تک نام و نشان بھی نہیں تھا۔ منظور صاحب علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ تدریس ان کا شعبہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان میں سب سے اہم مسئلہ بچوں کی تعلیم ہے۔ یہ مستقبل کی تعمیر کا مسئلہ تھا لیکن ان کے پاس وسائل نہیں تھے۔ گھر، زمین، جائیداد......... سب کچھ وہ ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے اور یہاں ایک جھونپڑی میں رہ رہے تھے۔ قابلیت کی وجہ سے روزگار ان کے لئے مسئلہ نہیں بنا۔ انہیں ایس ایم کالج میں لیکچرر شپ مل گئی۔ مگر ان کے مقاصد اور عزائم کچھ اور تھے۔ انہوں نے کبھی انہیں فراموش نہیں کیا۔

بستی پھیلتی چلی گئی اور ایک گنجان آبادی کا روپ دھار گئی۔ حالات ذرا بہتر ہوئے تو جھونپڑیاں، کچے مکانوں میں اور کچے مکان پختہ مکانوں میں تبدیل ہو گئے۔ بستی میں سرکاری اسکول بھی نہیں تھے۔ بچے اور لڑکے دن بھر گلیوں میں کنچے اور گلی ڈنڈا کھیلتے نظر آتے، مردوں کو فکرِ روزگار سے فرصت نہیں تھی کہ انہیں یہ تباہی نظر آتی۔ وہ تو سرزمین پاک پر اپنے قدم جمانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

ایسے میں منظور صاحب نے علاقے کے لوگوں کو جمع کیا اور انہیں تعلیم کی اہمیت اور اس بہت بڑی محرومی کا احساس دلایا جو خدانخواستہ پاکستان کا مستقبل تباہ کر سکتی تھی۔

انہوں نے اپنے گھر میں کوچنگ سنٹر کھولنے اور بچوں کو تعلیم دینے کا پروگرام بنایا۔ اس کوچنگ سنٹر کو انہوں نے اللہ کی تائید سے دس سال میں تعمیر پاکستان اکیڈمی میں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے انتھک اور بے لوث محنت کی۔ اپنا سب کچھ اس میں لگا دیا۔ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنا تمام وقت اسکول کو دیا اور اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اب تعمیر پاکستان ہائی اسکول کا شمار کراچی کے ممتاز ترین سکولوں میں ہوتا تھا۔ اس کے اولڈ بوائز نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔ وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور اپنی اپنی اہلیت کے مطابق ملک و قوم کے لئے بیش بہا خدمات انجام دے رہے تھے۔ وہ برملا اعتراف کر رہے تھے کہ منظور صاحب نہ ہوتے تو وہ اس وقت مزدوری کر رہے ہوتے۔ ان میں جو صاحب حیثیت تھے، وہ اسکول کی ترقی کے لئے امداد دیتے رہتے تھے۔ ضرورت مندوں کے بچوں کو اسکول میں نہ صرف مفت تعلیم دی جاتی تھی بلکہ انہیں کتابیں اور دیگر ضروری چیزیں بھی فراہم کی جاتی تھیں۔ وظائف اس کے علاوہ تھے۔ اب اسکول ایک ٹرسٹ کے زیرِاہتمام چل رہا تھا۔ ٹرسٹ کی منتظم اعلیٰ منظور صاحب کی بڑی بیٹی صفیہ تھی۔

دو سال پہلے منظور صاحب کا انتقال ہوا تھا تو لگتا تھا بستی یتیم ہو گئی ہے۔ ہر گھر میں سوگ تھا۔ منصور کو پہلی بار اپنی خوش بختی کا احساس ہوا تھا۔ باپ کی کمی کی تلافی تو ممکن ہی نہیں تھی لیکن وہ تنہا نہیں تھا۔ بستی کے ہر بڑے نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ بستی کے ہر گھر نے اسے ماں کی آغوش فراہم کی تھی، جس کی گرمی اسے یاد ہی نہیں تھی......... ملی ہی نہیں تھی۔ اس کی چار بہنیں تھیں اور چاروں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ باپ کی موت کے بعد بہنوں نے چاہا کہ منصور ان کے ساتھ رہ جائے لیکن منصور نے گوارا نہ کیا۔

منظور صاحب تمام انتظام کر کے گئے تھے۔ ان کی موت کے وقت منصور نے این ای ڈی میں انجینئرنگ کے پہلے سال میں داخلہ لیا تھا۔ منظور صاحب کی وصیت کے مطابق اسے اسکول کے ٹرسٹ سے اپنے تعلیمی اور دیگر اخراجات کے لئے اس وقت تک رقم ملنا تھی، جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جاتا۔

یہ تھا منصور کا پس منظر اور بستی والوں کا وہ احترام، جو اس کے والد نے ورثے میں

چھوڑا تھا مگر وہ خود ایسا لڑکا تھا کہ اس نے اس احترام کو محبت میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ بہت خوش اخلاق، خوش گفتار، خوش اطوار اور صاحبِ کردار لڑکا تھا۔ اس نے بھی بستی والوں پر ایک احسان کیا تھا.......... باپ سے بالکل مختلف......... لیکن اتنا ہی اہم۔ اسے بچپن سے ہی کرکٹ کا شوق تھا، اِدھر اُدھر بیٹھنے والے لڑکوں نے اسے کرکٹ کی طرف لگا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکوں کے پاس فرصت ہوتی ہے۔ اِدھر اُدھر بیٹھتے وہ مختلف قسم کی برائیوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ لفنگے پن کی ابتدا ایسے ہی ہوتی ہے۔ اس نے ایک کرکٹ ٹیم بنائی۔ پریکٹس کا اہتمام کیا۔ ٹیم میں ڈسپلن کی اہمیت پر زور دیا۔ ہار جیت کا غیر اہم ہونا ثابت کیا۔ علاقے میں اور بھی کرکٹ ٹیمیں تھیں لیکن اس کی ٹیم واحد ٹیم تھی جس کا کوئی لڑکا کبھی بدتمیز نہیں دیکھا گیا۔ وہ پریکٹس پر بچوں کو بھی لے جاتا تھا تاکہ ٹیم کو ٹیلنٹ ہمیشہ ملتا رہے۔ ٹیم کے کھلاڑیوں کے والدین اپنے لڑکوں میں مثبت تبدیلی کی وجہ سے اس کے احسان مند تھے۔ یہی نہیں، اس نے اپنے گھر میں چند انڈور گیمز کا اہتمام بھی کیا۔ وہ کھلا گھر تھا لیکن پاس پڑوس کے لوگوں کو وہاں لڑکوں کے جمع ہونے سے کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔ لڑکوں نے کبھی شور شرابہ نہیں کیا۔ کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ کبھی کسی گھر میں بیٹے کی ضرورت ہوتی تو وہ اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بجائے منصور کے گھر چلے آتے۔ یہ ایک اور خوبی تھی۔ غرضیکہ منصور بستی والوں کی آنکھوں کی تارا بن گیا تھا۔

اس شام وہ لوگ حسبِ معمول ناگوری ملک ہاؤس پر لسی پینے کے لئے رکے۔ کٹ بیگ لے کر منصور کے گھر جاتے ہوئے انہیں چوک پر لڑکوں کی بھیڑ نظر آئی لیکن وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ چوک سے کچھ لڑکے اِدھر اُدھر چلے گئے۔ باقی منصور کے گھر چلے آئے۔ وہاں وہ ہر روز ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہوتے تھے پھر کچھ لوگ کیرم کھیلنے لگتے، کوئی منصور کے ساتھ شطرنج کی بساط جما لیتا۔

ساڑھے سات بجے کے قریب باہر سے زبردست شور وغل کی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ لڑکے دروازے کی طرف لپکے مگر اسی وقت باہر سے حمید آگیا۔ اس کے پیچھے فاروق اور نعیم بھی تھے۔ ان کے چہرے اندرونی ہیجان سے تمتما رہے تھے۔

"کیا بات ہے حمید؟" شطرنج کھیلتے ہوئے منصور نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"وہ منصور بھائی۔۔ لڑکوں نے سات نمبر گلی والے ہندوؤں کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ

بنایا ہے۔" حمید نے بتایا۔

"تو ہندو یہاں کہاں سے آ گئے؟"

"وہ ابراہیم صاحب کا مکان تھا نا.......... اس میں آئے ہیں وہ لوگ۔" نعیم بولا۔

"ابھی انہیں یہاں آئے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ہے۔" ایک اور لڑکے نے بتایا۔

"یہ تو ثواب کا کام ہے۔" صفدر نے کہا۔ "چلو، ہم بھی ہاتھ بٹائیں۔"

منصور بساط چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ صفدر کی بات سن کر اس نے اسے گھورا۔ "کیا بکواس کرتے ہو۔ انسانوں کو مارنا ثواب کا کام کب سے ہو گیا؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ تو گھناؤنا فعل ہو گا۔ ہمیں ان کو روکنا چاہئے۔"

"لیکن منصور بھائی، وہاں ہندوستان میں مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا ہے، وہاں تو یہ بات کوئی نہیں سوچتا۔" صفدر کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"وہ کافر ہیں.......... جاہل ہیں.......... روشنی سے محروم۔ کیا ہم خود کو ان کی سطح پر لے آئیں۔ ہمیں تو ہمارے مذہب نے اعلیٰ اخلاقی اقدار سکھائی ہیں۔ ہمیں تو درگزر اور اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا سبق دیا گیا ہے۔"

"منصور بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سجاد نے کہا۔ کئی لڑکوں نے اس کی تائید میں سر ہلا دیئے لیکن چند لڑکے متذبذب تھے۔

"لیکن ہم ان لوگوں کو کیسے روک سکتے ہیں؟" فاروق نے کہا۔ وہ باہر کی صورت حال دیکھ کر آیا تھا۔ "ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

"اور وہ بہت مشتعل ہیں۔" حمید نے بتایا۔

"جلدی کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔" منصور باہر کی طرف لپکا۔

منصور کا گھر تین نمبر گلی میں تھا۔ اسی کے ساتھ سات نمبر گلی تھی۔ درمیان میں بس ایک سائیڈ اسٹریٹ تھی۔ گھر سے نکلتے ہی انہیں ہجوم نظر آیا۔ سائیڈ اسٹریٹ پر بھی لوگ جمع تھے۔ وہ بھیڑ میں گھستے گھساتے ساتویں گلی کے نکڑ پر پہنچے۔ وہ ساتویں گلی کا تیسرا مکان تھا۔ اس گلی میں تین عیسائی گھرانے بھی رہتے تھے۔ تیسرے مکان کے سامنے علاقے کے نوجوانوں کا ہجوم تھا۔ علاقے کا سب سے بڑا بدمعاش رحمت ان میں پیش پیش تھا۔ بات بات پر چاقو نکال لینا اس کا شیوہ تھا لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ اپنے محلے میں کسی سے

الجھے۔ رحمت اس گھر کے دروازے کو پیٹ رہا تھا۔ "دروازہ کھولو۔ ورنہ ہم دروازہ توڑ دے گا' اور پھر کسی کو نہیں بخشے گا۔" رحمت چیخ رہا تھا۔

گلی کافی کشادہ تھی لیکن لوگوں کا ہجوم اتنا تھا کہ چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔

"منصور بھائی' یہاں تو رحمت بھی موجود ہے۔" حمید نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "ہم اسے کیسے روک سکتے ہیں۔ یہاں تو خون خرابا ہو کر رہے گا۔"

"تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو یہیں رک جاؤ۔" منصور نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر وہ گلی کے دہانے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "ہٹیں ایک طرف۔ مجھے راستہ دیں پلیز۔" وہ راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ گلی میں ہر گھر کے دروازے پر عورتیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ تینوں گھروں کی عیسائی عورتیں ایک جگہ جمع ہو گئی تھیں۔ ان کی ہمدردیاں ہندوؤں کے ساتھ ہوں گی لیکن آواز اٹھانے کی ہمت ان میں نہیں تھی۔ دبی دبی سرگوشیوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

منصور جگہ بناتا ہوا تیسرے گھر کے دروازے کے قریب پہنچا۔ کرکٹ ٹیم کے تمام لڑکے اس کے پیچھے تھے۔ وہ رحمت کی موجودگی اور لڑکوں کے اشتعال کی وجہ سے خوفزدہ تھے لیکن منصور کو تنہا بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ حالانکہ ان میں سے کچھ کے نزدیک جو کچھ ہو رہا تھا' درست تھا......... اور ان کے خیال میں منصور کا مؤقف غلط تھا لیکن وہ منصور کا اتنا لحاظ کرتے تھے کہ یہ بات اس سے نہیں کہہ سکتے تھے۔

یہ لوگ دروازے کے قریب پہنچے تو بات بڑھ چکی تھی۔ بند دروازے کے پیچھے سے ایک نسوانی آواز نے کہا۔ "تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" لہجے میں خوف تھا۔ "ہمارا قصور کیا ہے؟"

"اپنے مردوں کو باہر نکالو۔" رحمت نے للکار کر کہا۔ "ورنہ ہم دروازہ توڑ دے گا......... اور پھر کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔" یہ کہہ کر اس نے دروازے پر پوری قوت سے لات رسید کی۔

عورت گڑگڑانے لگی۔ اسی لمحے اندر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔ "ماں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔" اس کے جواب میں عورت گڑگڑانے لگی' ساتھ ہی نسوانی آوازیں ابھریں' جو مرد کو رکنے کو کہہ رہی تھیں۔ پھر وہ

باقاعدہ بین کرنے لگیں۔

دروازہ کھلا اور ایک بیس بائیس سالہ نوجوان باہر آیا۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ اسے دیکھ کر منصور کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے ذہن میں ہندوؤں کا جو تصور تھا' لڑکا اس پر کسی اعتبار سے پورا نہیں اترتا تھا۔ نہ اس کے سر پر چوٹی تھی' نہ پیشانی پر تلک تھا اور نہ ہی اس نے دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ وہ ٹی شرٹ اور پتلون پہنے تھا اور دوسرے لڑکوں جیسا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کم از کم منصور یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ہندو ہے۔

"تم لوگ ہندو ہو؟" رحمت نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"ہہ......... ہہ......... ہا......... ہاں........." نوجوان کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

"نام کیا ہے بے تیرا؟"

"شش......... شش......... شن......... شنکر۔" نوجوان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ لگتا تھا' وہ اپنے پیروں پر اب چند لمحے بھی نہیں کھڑا رہ سکے گا۔

"نام کیا پوچھتے ہو استاد۔ مارو سالے کو۔" آگے کھڑے ایک لڑکے نے کہا اور ساتھ ہی ہندو لڑکے کے منہ پر گھونسا رسید کر دیا۔ ہندو لڑکا گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی دو لڑکوں نے لاتوں سے اس کی تواضع شروع کر دی۔

اس دوران منصور وہاں پہنچ چکا تھا۔ "ارے......... یہ کیا کرتے ہو۔ دور ہٹو۔ خبردار......... اسے نہ مارو۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھا۔

لیکن رحمت نے ہاتھ پھیلا کر اسے روک دیا۔ "ان کے حمایتی بن کر آئے ہو بابو؟" اس نے گرج کر پوچھا۔

"رحمت دادا......... انہیں روکو۔ یہ زیادتی ہے۔" منصور نے التجا کی۔

"کافروں کی حمایت کر رہے ہو۔ کیا دین چھوڑ بیٹھے ہو اپنا؟" رحمت نے طنز کیا۔

منصور کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "نہیں رحمت دادا۔ جو ہمارے دین نے سکھایا ہے' وہی بتانے کے لئے آیا ہوں۔"

"چلے جاؤ۔ ورنہ تمہیں بھی ختم کر دوں گا۔ ہم ان کافروں کی حمایت نہیں برداشت کرے گا' جو مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہا رہے ہیں........."

اچانک دروازہ کھلا اور تین نوجوان لڑکیاں باہر نکلیں۔ ان کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اس کے پیچھے دو ڈھائی سال کی ایک بے حد خوبصورت بچی روتی ہوئی دروازے پر آئی۔ "بھگوان کے لئے......... بھیا کو نہ مارو۔" بڑی لڑکی گڑگڑائی۔ ادھیڑ عمر عورت دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ بچی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس سہم کر روئے جا رہی تھی۔ تینوں لڑکیاں زمین پر پڑے بھائی پر ڈھال بن کر چھا گئیں۔

"میں تم سے بنتی کرتی ہوں، اسے چھوڑ دو۔" ادھیڑ عمر عورت نے روتے ہوئے کہا۔

ہندو کو مارنے والے نوجوان لڑکیوں کو ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن لڑکیاں بھائی سے بری طرح چمٹی ہوئی تھیں۔

"رحمت دادا، یہ سب کچھ کروا رہے ہو تم۔ تم تو بدمعاش ہو کر بھی بستی کی ماؤں بہنوں کے محافظ تھے۔" منصور کے لہجے میں عجیب سی گھن گرج تھی۔

"یہ کافر عورتیں بستی کی ماں بہن نہیں ہیں۔" رحمت نے بڑے سکون سے کہا۔

دوسری طرف لڑکیوں اور جارح نوجوانوں میں کشمکش جاری تھی۔

"انہیں روکتے ہو دادا یا یہ کام مجھے کرنا پڑے گا!" منصور نے بپھر کر کہا۔

لڑکیوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے والے نوجوانوں نے سر اٹھا کر خونخوار نظروں سے منصور کو دیکھا۔ رحمت کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا۔ بستی میں آج تک کسی نے اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ "او منصور بابو!" وہ غرایا۔ "اپنی کھال میں رہ۔ ماسٹر مرحوم کا خیال نہ ہوتا تو زبان کھینچ لیتا گدی سے ابھی......... جا......... چلا جا یہاں سے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" منصور نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "پہلے میری بات سن لو۔ سمجھ میں آ جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ........."

لڑکیوں سے زور آزمائی کرنے والوں میں سے ایک کو غصہ آ گیا تھا۔ "یہ یوں نہیں مانیں گی۔" اس نے سب سے بڑی لڑکی کے بال مٹھی میں پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے لڑکی کے رخسار پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ ہندو عورت چیخ چیخ کر رونے لگی۔

"ہے بھگوان......... ہے بھگوان......... دیا کر۔"

"یہ بھی خاموشی سے دیکھ لو گے رحمت دادا!" منصور چلایا۔ "کیسے مسلمان ہو تم؟ اب یہ تمہارے چیلے عورتوں پر ہاتھ اٹھائیں گے۔"

رحمت نے جھک کر اس لڑکے کے تھپڑ رسید کیا اور گرج کر بولا۔ "ہٹ جاؤ یہاں سے۔ انہیں چھوڑ دو۔ ہاتھ روکو۔"

لڑکوں نے سر اٹھا کر رحمت کو حیرت سے دیکھا اور ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ رحمت، منصور کی طرف متوجہ ہوا۔ "اے بابو......... اب تو اپنی کتھا سنا دے ذرا جلدی سے۔" اس نے کڑے لہجے میں کہا۔ "بول......... تجھے کیا تکلیف ہے؟"

منصور نے زمین پر پڑے ہندو لڑکے کو دیکھا۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ وہ یوں بے بس پڑا تھا، جیسے خود سے کبھی نہ اٹھ سکے گا۔

تینوں لڑکیاں اب بھی اس کی ڈھال بنی ہوئی تھیں۔ سب سے بڑی اور سب سے چھوٹی کے چہرے فق تھے۔ ان پر لرزہ چڑھا ہوا تھا البتہ منجھلی لڑکی خود پر قابو پائے ہوئے تھی۔ یہی نہیں، اس کی آنکھوں میں آگ سی دہکتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے انداز میں ہٹ دھرمی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت ضدی لڑکی ہے۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں رحمت دادا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، غلط ہے۔" منصور نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"اور ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ٹھیک ہے؟" رحمت نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ لیکن اس کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔"

اب ہر طرف سناٹا تھا۔ لوگ سانسیں روکے کھڑے تھے۔ عورتوں کی سرگوشیاں بھی دم توڑ گئی تھیں۔ سب سوچ رہے تھے کہ اب رحمت کا ہاتھ حرکت میں آئے گا۔ اس میں چاقو لہرائے گا اور.........

بھائی پر گری ہوئی منجھلی بہن نے سر اٹھا کر منصور کو دیکھا، اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں خوف اور حیرت گھل مل گئی تھی۔

"کیوں۔ وہ جو وہاں نہتے مسلمانوں کو بلاوجہ قتل کر رہے ہیں، پولیس اور فوج کی مدد سے......... وہ ان کے بھائی بند نہیں؟" رحمت نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"وہ ان کے ہم مذہب ہیں لیکن یہ وہ تو نہیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا پڑھے لکھے بابو!"

"اچھا رحمت دادا' تم یہ بتاؤ کہ تم یہ سب مسلمان ہونے کے ناتے کر رہے ہو نا؟" منصور نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں غنڈہ سہی لیکن مسلمان ہوں۔" رحمت نے سینہ پھلا کر کہا۔

"ایک بات بتاؤ دادا' ظلم کے خلاف لڑنا جہاد ہوتا ہے نا؟"

"ہاں!"

"ہمارے مذہب نے ہمیں ظلم کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ ظلم کے بدلے ظلم کرنے کا نہیں۔ مجاہد اور ظالم میں بڑا فرق ہوتا ہے دادا!"

رحمت کے انداز میں پہلی بار بے یقینی جھلکی۔ "لیکن.........."

"میری بات سن لو دادا!" منصور نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نہتے کو قتل کرو گے' عورتوں پر ہاتھ اٹھاؤ گے' کمزوروں کا گھر جلاؤ گے تو کیا یہ جہاد ہوگا؟ نہیں دادا.......... یہ ظلم ہوگا۔ اس سے زیادہ گھناؤنا ظلم' جو بھارت میں ہندو کر رہے ہیں۔ زیادہ اس لئے کہ ہمیں اللہ نے ہدایت کی روشنی دی ہے اور وہ اندھیرے میں ہیں' جاہل ہیں۔"

رحمت کے چہرے پر زلزلے کا تاثر ابھرا۔ منصور کی دلیل نے اسے ہلا کے رکھ دیا تھا۔

"میں تمہیں چند باتیں یاد دلانا چاہتا ہوں دادا!" منصور اپنی کہے جا رہا تھا۔ "تم اس دین کامل کے ماننے والوں میں ہو' جو تمہیں حکم دیتا ہے کہ باپ کے جرم کی سزا اولاد کو نہیں ملے گی۔ تم اس پیغمبر ﷺ کی امت میں سے ہو جنہیں کفار نے ہمیشہ بدترین اذیتیں دیں لیکن آپ ﷺ نے انہیں کبھی بددعا نہیں دی۔ جن پر بے ہدایت لوگوں نے غلاظتیں پھینکیں' پتھر مارے اور راستے میں کانٹے بچھانے کا معمول بنایا اور کسی دن اس معمول میں فرق پڑا تو آپ ﷺ اذیت دینے والوں کے لئے پریشان ہو گئے۔ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ تم ان ﷺ کے امتی ہو رحمت دادا' جو رحمتہ اللعالمین تھے۔ رحمتہ للعالمین کا مطلب سمجھتے ہو۔ تمام عالم کے لئے.......... سب انسانوں کے

لئے.......... بلاتفریق مذہب سب انسانوں کے لئے رحمت.........."

رحمت کا چہرہ پسینے میں نہا گیا تھا۔ "بس کرو بابو' تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ "تم نے ہمیں بہت بڑے گناہ سے بچا لیا۔" پھر وہ ہندو عورت کی طرف مڑا۔ "مائی' ہم کو معاف کرنا۔ ابھی تم یہاں بے کھٹکے رہو۔ رحمت کے ہوتے یہاں کوئی تم کو کبھی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔"

"لیکن استاد!" جارح لڑکوں نے احتجاج کیا۔

"بس۔ ابھی چل دو یہاں سے اور اپنا گارنٹی سن لیا نا تم نے۔" رحمت نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "ابھی ان لوگوں کو کبھی تنگ نہ کرنا۔ چلو.......... آؤ۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے وہ لڑکے تھے جو اس گھر کو آگ لگانے کے ارادے سے آئے تھے۔ ان کے چہروں پر مایوسی تھی اور وہ منصور کو کینہ توز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

دو کرسچن عورتیں اپنے گھر سے نکلیں اور اس طرف آئیں۔ "بیٹا.......... تم نے بڑی نیکی کا کام کیا۔" ان میں سے ایک نے منصور سے کہا۔ پھر وہ دونوں ہندو فیملی کی طرف بڑھ گئیں۔ تینوں بہنیں بھائی کو سہارا دے کر اٹھا رہی تھیں۔ لڑکے کا حال بہت برا تھا۔ اس کے لئے اب بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار تھا۔ ہندو عورت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی مگر اب اس کے رونے میں سکون اور طمانیت کا عنصر نمایاں تھا۔ لڑکیوں میں منجھلی لڑکی ہی تھی' جو سنبھلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ سب گھر میں گھسے۔ منجھلی لڑکی سب سے پیچھے تھی۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے وہ منصور کو جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ عقیدت بھری چمک۔

منصور اور اس کے ساتھی واپس جانے لگے۔ دروازوں پر کھڑی عورتوں میں سے ایک نے کہا۔ "منصور بیٹے' تمہیں خدا خوش رکھے۔ تم نے بڑا کام کیا ہے۔ ہم پاکستان کی راہ میں اپنا گھر جلا کر' سب کچھ لٹا کر' اپنے پیاروں کی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے آنے والے' ایک ہندو گھر سے کس کس چیز کا بدلہ لے سکتے ہیں۔ ہمیں تو اللہ نے اس کا صلہ ایک پیارے وطن کی شکل میں دے دیا ہے۔ وہ بڑا صلہ دینے والا ہے بیٹے!"

"ہاں بہن۔ ذرا دیر پہلے میں سوچ رہی تھی کہ لڑکے ٹھیک کر رہے ہیں۔ وہاں

مسلمان مر رہے ہیں تو یہاں ہندوؤں کو کیوں چھوڑا جائے۔" دوسری عورت نے شرمندگی سے کہا۔ "لیکن منصور نے بالکل ٹھیک کیا۔"

لیکن کچھ عورتیں ناخوش بھی تھیں۔

☆======☆======☆

اس رات منصور سونے کے لئے لیٹا تو وہ زندگی میں دوسرا موقع تھا کہ نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ پہلا موقع اباجان کی موت والی رات آیا تھا۔ اباجان کی تدفین ہو چکی تھی۔ چاروں بہنیں اور بہنوئی گھر میں موجود تھے۔ وہ دیر تک اس کی دلجوئی کرتے رہے۔ بالآخر وہ یہ سوچ کر سوتا بن گیا کہ یوں وہ ان کے لئے بھی بے آرامی کا سبب بنے گا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بہنیں اس سے باتیں کرتی رہیں۔ پہلے وہ نیند میں ڈوبی آواز بنا کر انہیں ہوں' ہاں میں جواب دیتا رہا۔ پھر اس نے جپ سادھ لی۔ بہنیں مطمئن ہو کر چلی گئیں۔ تمام لائٹیں بجھا دی گئی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور چھت کو گھورتا رہا۔ چند لمحوں بعد چھت اسکرین کی طرح روشن ہو گئی اور اس پر بیتے لمحوں کا باتصویر سفر شروع ہو گیا۔ بچپن کی یادداشت کے پہلے لمحے سے لے کر اباجان کی زندگی کے آخری لمحے تک کا سفر مکمل ہو گیا۔ اسے لگا' جیسے اس کا سینہ......... اس کا وجود خالی ہو گیا ہے۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ اسے کھوکھلے پن کا احساس ہونے لگا۔ اس نے ریڈیم ڈائل والی گھڑی میں وقت دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اتنی ذرا سی دیر! صرف چالیس منٹ میں وہ زندگی کے پندرہ سال دوبارہ جی لیا تھا۔ پندرہ سال......... اور چالیس منٹ!

اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔ سینے پر بہت بوجھ تھا۔ جی چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح روئے لیکن سینے پر جیسے کوئی چٹان رکھی تھی' جو ہل بھی نہیں سکتی تھی جس کے پگھلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ رونے کو ترستا رہا۔ اس نے اباجان کی ہر بات یاد کی۔ خود پر رقت طاری کرنے کی کوشش کی لیکن خشک آنکھیں صحراؤں کی طرح جھلستی ہی رہیں۔ اس کی پلکیں تک نم نہ ہوئیں۔

وہ اٹھ کر کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ قرار نہ آیا تو وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ اباجان کے کمرے کی طرف تھا۔

وہ اباجان کے کمرے میں داخل ہوا اور چوکھٹ سے ایک قدم آگے ہی رک گیا۔

کمرے میں اندھیرا تھا لیکن اس کمرے کو دیکھنے کے لئے اسے روشنی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کمرے میں وہ آنکھیں بند کر کے بھی چل سکتا تھا۔ سامنے کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ اباجان کی میز تھی' جس کے ساتھ ریوالونگ چیئر تھی۔ داہنے ہاتھ والی دیوار پر شیلف لگا تھا۔ اس میں ایک طرف تدریس کے موضوع پر دنیا بھر کی کتابیں تھیں' دوسری طرف اردو ادب تھا۔ میز پر اباجان کی عینک ہمیشہ کی طرح الٹی رکھی تھی۔ سامنے ٹیبل لیمپ تھا۔ ایک جانب اردو کی لغات تھی اور دوسری طرف ڈکشنریاں رکھی تھیں۔ بائیں جانب والی دیوار کے ساتھ ان کا بیڈ رکھا تھا۔ وہیں ایک صوفہ سیٹ اور دو چھوٹی میزیں تھیں۔

وہ چند لمحے کھڑا کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ یہاں اسے اباجان کی موجودگی کا......... اور اس کے نتیجے میں سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر بڑی آہستگی سے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اندھیرا کچھ اور بڑھ گیا۔ وہ میز کی طرف بڑھ گیا۔ میز کے گرد گھوم کر وہ کرسی کے پاس پہنچا اور کرسی کے ہر حصے کو یوں سہلاتا رہا' جیسے مرحوم باپ کے لمس کا ریشم سمیٹ رہا ہو۔ چند لمحے ہچکچانے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی جیسے پورا منظر بدل گیا.........

پورا منظر بدل گیا لوگو
لمحہ بھر کو جھپک گئیں آنکھیں

کمرے میں دھوپ اتری ہوئی تھی۔ سردی کے دن تھے۔ اباجان اپنی کرسی پر بیٹھے تھے۔ وہ ان کے سامنے میز کے دوسری طرف بیٹھا تھا۔ اباجان نے کتاب سے نظریں اٹھائیں اور مطالعے کی عینک کے شیشوں کے اوپر سے اسے بغور دیکھا۔ "کوئی خاص بات ہے بیٹے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی اباجان۔ خاص ہی ہے۔"

اباجان نے عینک اتاری اور میز پر الٹ کر رکھ دی۔ "کہو......... کیا مسئلہ ہے؟"

"ہر باپ اپنے بیٹے سے پوچھتا ہے کہ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے۔ آپ نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا۔" اس نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

اباجان مسکرائے۔ مسکراہٹ کی چمک کی وجہ سے ان کی آنکھیں اور خوبصورت اور

روشن لگنے لگیں۔ "ضرورت ہی نہیں پڑی پوچھنے کی۔" انہوں نے کہا۔

"میں بہت پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اب تو میں انجینئرنگ کے مضامین میں داخلہ لے چکا ہوں لیکن باپ تو بچوں سے اس وقت سوال کرتے ہیں' جب بچوں نے اپنی سمتوں کا تعین بھی نہیں کیا ہوتا ہے۔ آپ نے تو اس وقت بھی مجھ سے یہ بات نہیں پوچھی۔"

اباجان سنجیدہ ہو گئے۔ "ہاں' میں نے کبھی نہیں پوچھا۔ اس لئے کہ جو کچھ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں' اس کے لئے میں نے ہر سانس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے اور اللہ نے مجھے یقین اور طمانیت عطا فرمائی ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ میں مطمئن ہوں تمہاری طرف سے۔"

"میں سمجھا نہیں اباجان۔"

"میں تمہیں بہت اچھا مسلمان دیکھنا چاہتا ہوں۔ حشر کے روز تمہارا حوالہ' تمہاری پہچان تمہارا بہت اچھا انجینئر ہونا نہیں ہوگا۔ اچھا مسلمان بہت اچھا انسان ہوتا ہے اور بہت اچھا مسلمان تو عظیم انسان ہوتا ہے۔"

"تو آپ نے مجھے اچھا انسان بنانے کے لئے کیا کیا؟"

"میں نے ہر تعلیم سے پہلے تمہیں کلام پاک کی تعلیم دی' دین کے ارکان سے متعارف کرایا' نماز سکھائی' تمہیں اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کرایا' کردار کی اہمیت بتائی' اسلامی معاشرے میں حقوق و فرائض کی اہمیت سے آگاہ کیا' سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ سے ہر لمحے تمہارے لئے توفیق و ہدایت طلب کی.........."

"لیکن آپ نے مجھ پر کبھی نماز پڑھنے کے لئے دباؤ نہیں ڈالا۔"

"ہاں' یہ میری کوتاہی ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے' لیکن بیٹے' صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے سے آدمی اچھا مسلمان نہیں بن سکتا۔ آدمی نماز پڑھے' عبادات کرے لیکن انسانوں کو تکلیف پہنچائے' پڑوسیوں کو نقصان پہنچائے' والدین کی نافرمانی کرے تو وہ اچھا مسلمان تو کیا' اچھا انسان بھی نہیں بن سکتا۔ میں نے ہمیشہ تمہیں حقوق العباد اور حقوق اللہ کے بارے میں بتایا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ بندے پر اپنے حقوق وہ معاف کر دیں گے.........اور وہ بڑے رحم والے ہیں لیکن بندوں کے حقوق اللہ اس وقت تک معاف نہیں کریں گے' جب تک وہ بندہ معاف نہ کرے جس کی حق تلفی ہوئی ہے۔" انہوں

نے ایک گہری سانس لی۔ "دیکھو بیٹے' اللہ سے محبت کرنا کتنا آسان ہے لیکن بہت مشکل ہے۔ سو اس سے بالواسطہ محبت کی جاتی ہے کہ یہ آسان ہے۔ اس کے بندوں سے محبت کرو۔ اس تک پہنچ جاؤ گے۔ براہ راست پہنچنا چاہو گے تو بھٹکنے کا احتمال رہے گا۔ اس طرح بہت اچھا مسلمان بننے کے لئے پہلے اچھا انسان بنو۔ بہت اچھا انسان بن جاؤ گے تو صرف نماز روزے کی کمی ہوگی اور اللہ پاک انسانوں سے تمہارے سلوک اور محبت سے خوش ہو کر تمہیں اپنے راستے پر بلالیں گے۔ اللہ کی طرف سے توفیق و ہدایت ملے گی تو یہ منزل آسان ہو جائے گی' نماز ایسی عادت ہے' جو آسانی سے ترک بھی نہیں کی جا سکتی۔ کی جائے تو آدمی بے سکون ہو جاتا ہے۔ مسلسل چالیس نمازیں پڑھ لی جائیں تو کہتے ہیں کہ پھر آدمی سے نماز قضا نہیں کی جاتی۔"

"شکریہ اباجان۔ آپ کی دعائیں انشاء اللہ رائیگاں نہیں جائیں گی۔ میں انشاء اللہ اچھا مسلمان اور اچھا انسان بنوں گا۔"

منصور نے پلکیں جھپکائیں اور منظر پھر بدل گیا۔ وہی تاریک کمرا تھا۔ وہ اباجان کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے والی کرسی خالی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ اس نے لغات اپنی طرف کھینچی' اسے کھولا اور اباجان کی عینک لگا کر پڑھنے کی کوشش کی لیکن حروف بہت بڑے بڑے نظر آ رہے تھے.......... اور دھندلا بھی رہے تھے۔ اس کے اندر کسی نے سرگوشی کی.......... ابھی تم اباجان سے بہت پیچھے ہو منصور۔ تم ان کی آنکھوں سے دنیا نہیں دیکھ سکتے۔ اچھے انسان بنو..........

اچانک اس کے سینے پر رکھی چٹان مرتعش ہوئی۔ حلق دکھنے لگا۔ آنکھوں میں جلن سی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ سینے پر رکھی چٹان موم کے ڈھیر کی طرح پگھل رہی تھی۔ اس نے ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔

خاصی دیر کے بعد وہ کرسی سے اٹھا۔ بیڈ کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھی اباجان کی جانماز پر پڑی۔ اس کے اندر ایک بے ساختہ خواہش مچلی۔ وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ وضو کر کے وہ باہر آیا' اباجان کی جانماز بچھائی اور خدا کے حضور سر بہ سجود ہو گیا۔ نماز پڑھ کر وہ اٹھا تو پُرسکون تھا۔ وہ اباجان کے بیڈ پر جا لیٹا۔ ان کا تکیہ' ان کی چادر' بستر ہر چیز میں جیسے ان کی خوشبو اب بھی موجود تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹا اور چادر اوڑھی تو

اسے اپنا بچپن یاد آگیا۔ اسے لگا کہ وہ چھوٹا سا بچہ ہے' جسے اباجان نے اپنے سینے پر لٹالیا ہے۔ بچپن میں جب اسے نیند آتی تھی تو وہ اسے سینے پر لٹا لیتے تھے۔ اس کی پیٹھ تھپکتے' اس کا سر سہلاتے' اسے کہانیاں سناتے......... اور اسے پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ کب سو گیا۔

اس رات وہ تکیہ اس کا سر سہلا رہا تھا۔ چادر اس کی پیٹھ تھپک رہی تھی۔ بیڈ نے ان کے سینے کی طرح اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔ ان کی آواز اسے زندگی کے قرینے تعلیم کر رہی تھی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب سو گیا۔ اسے یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ صفیہ اس کے کمرے میں گئی اور کمرہ خالی پا کر پریشان ہو گئی تھی مگر فوراً ہی اسے خیال آیا تھا کہ منصور یقیناً اباجان کے کمرے میں ہو گا۔ وہ وہاں آئی تھی۔ اسے سوتا دیکھ کر اسے اس پر پیار آیا تھا۔ وہ اس کی پیشانی چوم کر اور اسے ٹھیک طرح سے چادر اوڑھا کر دبے پاؤں واپس چلی گئی تھی۔

اور آج رات......... یہ زندگی میں دوسرا موقع تھا کہ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

وہ سونے کے لئے لیٹا۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ اس کے تصور میں ایک دلکش سراپا ابھر آیا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا۔ ایسا تو ہوتا نہیں کہ تصور چہرے کے نقوش اور جسم کے تمام پیچ و خم سمیت کوئی وجود تخلیق کرے......... اور وہ بھی بالکل حقیقی انداز میں۔ یہ زورِ تخیل تو شاید صرف مصوروں کو نصیب ہوتا ہے......... اور وہ بھی ان مصوروں کو جنہیں قدرت نے پیدائشی طور پر اس نعمت سے نوازا ہو......... ورنہ بیشتر مصور تو بس نقال ہوتے ہیں۔

کئی لمحے گزر گئے۔ وہ سراپا اب بھی اس کے تصور میں جلوہ گر تھا......... جیسے چپک کے رہ گیا ہو۔ اچانک اسے جھٹکا سا لگا۔ وہ تو حقیقی سراپا تھا۔ اس احساس نے اسے چونکا دیا۔ یہ وہ دوسرا سراپا تھا' جو اس نے چند گھنٹے پہلے سچ مچ دیکھا تھا۔ مگر یہ بھی صرف اس کا احساس تھا......... یقین سے عاری۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اس لڑکی کو تو اس نے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ ہندو لڑکی......... پٹنے والے ہندو لڑکے کی منجھلی بہن' جو اپنی دوسری بہنوں اور ماں کے برعکس اتنی خوفناک صورت حال میں بھی پُرسکون اور پُراعتماد تھی۔

اس تصور یا تخیل میں ایک غیر معمولی پہلو اور بھی تھا۔ سچ یہ تھا کہ اس نے کبھی کسی

لڑکی کو بھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ محلے میں کتنی لڑکیاں تھیں' جو اس کے ساتھ کھیل کر' پڑھ کر جوان ہوئی تھیں۔ اس نے ان کے ساتھ وقت گزارا تھا لیکن وہ تصور میں انہیں صرف ہیولے کے روپ میں دیکھ سکتا تھا اور ان کے خدوخال اس کے تصور میں نہیں ابھرتے تھے۔ اس وقت اس نے آزمائش کے لئے ان لڑکیوں کا تصور کرنے کی کوشش کی۔ رشیدہ......... فرزانہ......... بشریٰ......... سیما......... طلعت......... غزالہ......... لیکن نہیں' ان کا تصور کرنا تو درکنار' وہ تصور میں بسے ہوئے اس سراپا کو بھی نہیں جھٹک سکا۔

اس نے خود کو اس خیال سے بہلانے کی کوشش کی کہ اتنی سنگین صورتِ حال میں لڑکی کا غیر معمولی رویہ اس کے لئے کشش کا باعث ہوا ہو گا لیکن اس کے دل کی دھڑکنیں کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔ دل اتنے خوشگوار انداز میں کبھی دھڑکا ہی نہیں تھا۔ جن محسوسات سے اب وہ آشنا ہو رہا تھا' وہ اس کے لئے بالکل نئے تھے۔ اسے اپنے رگ و پے میں عجیب سی' میٹھی سی سنسنی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ضدی سراپا ایسا منتشر ہوا جیسی پانی پر عکس ایک چھوٹے سے کنکر سے چکنا چور ہو جائے۔ ساتھ ہی اس احساس نے اسے افسردہ کر دیا کہ کوئی بہت خوبصورت اور نازک چیز مٹ گئی ہے۔

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ کیا میرا دماغ چل گیا ہے؟ اسی لمحے ایک مصرع اس کے ذہن میں در آیا۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ لاحول ولا قوۃ' وہ بہ آواز بلند بڑبڑایا۔ یہ عشق کہاں سے آ کودا بیچ میں......... اچھا......... موقع ملے تو دیکھ لینا۔ اس نے خود کلامی کی۔ وہ لڑکی درحقیقت میرے اس تخیل سے یکسر مختلف ہو گی۔ اس خیال کے حق میں دلیلیں بھی تھیں......... اور دلیلیں بھی مبنی بر حقیقت۔ اس نے لڑکی کو واقعی نہیں دیکھا تھا۔ کم از کم اس طرح نہیں دیکھا تھا کہ اس کا اتنا مکمل تصور کر پاتا۔

وہ کروٹیں بدلتا اور الجھتا رہا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ ضدی سراپا بند پلکوں کے پیچھے تھرکنے لگتا۔ نہ جانے کب......... لیکن بڑی مشکل سے اسے نیند آئی اور وہ خواب سے محروم نیند تھی۔ ورنہ نیند کی آغوش میں اترتے وقت اس نے سوچا تھا کہ اب شاید وہ

خواب میں بھی اسے پریشان کرے گی۔

لیکن اس نے تو اگلے روز بھی اسے پریشان نہیں کیا۔ یونیورسٹی میں اس کا وقت معمول کے مطابق گزرا۔ اس کی توجہ ذرا نہیں ہٹی۔ اسے ایک لمحے کے لئے بھی اس کا خیال نہیں آیا۔ بلکہ اس کے ذہن سے تو جیسے وہ واقعہ ہی محو ہو گیا تھا۔

اس روز کوئی پریکٹیکل نہیں تھا اس لئے وہ دو بجے گھر پہنچ گیا۔ رات ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا۔ وہ سونے کے لئے لیٹ گیا۔ آنکھ بھی فوراً ہی لگ گئی مگر پھر دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک نے اسے گہری نیند سے جگا دیا۔ وہ جھومتا جھامتا بڑھا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر ایک دس گیارہ سالہ لڑکا کھڑا تھا۔ اسے منصور نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ اس کا سوتا ہوا ذہن اس تضاد کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اسے کرنٹ سا لگا۔ یہ تو وہی چہرہ تھا جو گذشتہ رات بند پلکوں کے پیچھے تھرکتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ نیند جیسے اڑ گئی۔

لڑکا ویسے ہی جھجک رہا تھا۔ منصور میں تبدیلی رونما ہوتے دیکھ کر وہ اور نروس ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ کوئی آواز نہیں نکلی۔

"کیا بات ہے؟" منصور نے اسے نروس دیکھ کر بے حد نرم لہجے میں کہا۔ حالانکہ اس کا پہلا بے ساختہ سوال یہ ہونا چاہئے تھا.......... کون ہو تم؟ مگر پھر یہ بھی ہے کہ وہ یہ بات اپنے تصور کے حوالے سے جان گیا تھا۔ لہٰذا یہ سوال غیر ضروری تھا۔

"ماں.......... ماں آپ کو بلاتی ہے۔" لڑکے نے کہا۔

منصور کو اس کی زبان اور لہجہ دونوں نامانوس لگے۔ "کون.......... کہاں..........؟" نہ جانے کیوں وہ گڑبڑا گیا۔

لڑکے کی سمجھ میں پہلے تو کوئی جواب ہی نہ آیا۔ پھر اس نے گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ سڑک کے پار والی گلی میں.......... ماں گھر میں ہے۔ وہ آپ کو بلاتی ہے۔"

منصور کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اسے اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔

"آؤ.......... اندر آ جاؤ۔" اس نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل سو رہا تھا۔ ذرا منہ دھو لوں پھر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا لیکن لڑکا اندر نہیں آیا۔ منصور نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور تولئے سے خشک کرنے کے بعد باہر آیا۔ لڑکا بدستور دروازے پر کھڑا تھا۔ منصور نے باہر سے دروازے کی کنڈی لگائی اور بولا۔ "چلو۔"

"صرف کڑی مارو گے آپ؟ تالا نہیں لگاؤ گے!" لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

منصور کی سمجھ میں اس کی بات آ گئی۔ یہ کڑی مارنا دراصل کنڈی لگانا تھا۔ وہ مسکرایا۔ "نہیں' اس کی ضرورت نہیں۔"

وہ لڑکے کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس نے لڑکے سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"منوہر۔" لڑکے نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "منوہر لال۔"

منوہر نامی اس لڑکے نے اپنے مکان کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ "آپ آ جاؤ۔" اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"تم ماں کو بلا لاؤ۔ میں یہاں کھڑا ہوں۔" منصور نے کہا۔ اب جھجکنے کی اس کی باری تھی۔

لڑکا دروازہ بند کئے بغیر اندر چلا گیا۔ ایک لمحے بعد منصور نے اس کی آواز سنی۔

"ماں.......... منصور بھائی آوی گیو چھے۔" (ماں' منصور بھائی آ گیا ہے۔)

"تو اندر بلائی ناکھ ڈھینگرا۔" ایک نسوانی آواز نے کہا۔ (تو اندر بلا لے نا بے وقوف!)

"تمے آپی جاؤ.........." لڑکے کی آواز دور جاتی ہوئی تھی۔ (تم خود چلی جاؤ۔)

منصور پوری طرح تو نہیں سمجھ سکا لیکن اس گفتگو کا مفہوم اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ کرکٹ میچوں کے سلسلے میں میمن لڑکوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ گجراتی زبان کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ ہندو گجراتی کیسے بول رہے ہیں۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ ہندو صرف ہندی بولتے ہیں۔

اتنے میں وہ ادھیڑ عمر ہندو عورت دروازے پر چلی آئی تھی' جسے اس نے گذشتہ

رات دیکھا تھا۔ "آ......... نانڈلا' اندر آ جا۔" اس نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ "آ جا میرا لال۔"

منصور ہچکچایا لیکن عورت کے لہجے میں اتنی محبت تھی کہ وہ اندر چلا گیا۔ سامنے ہی خاصا کشادہ آنگن تھا۔ دروازے کے عین سامنے نیچی چھت کا ایک کمرہ تھا۔ بائیں جانب برابر برابر دو کمرے تھے۔ اس کا اندازہ دو دروازوں سے ہوا تھا۔ دور والے کمرے کے ساتھ نیچی چھت والے کمرے کے برابر کچن تھا۔

عورت اسے دروازے کے قریب والے کمرے میں لے گئی۔ اس کمرے کو وہ ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ چھوٹا کمرہ تھا۔ اس میں ایک صوفہ سیٹ تھا۔ درمیان میں ایک میز تھی۔ دونوں کمروں کے درمیانی دروازے پر پردہ لٹکا تھا۔ منصور سائیڈ میں آڑے رکھے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔ عورت تھری سیٹ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"نانڈلا......... کل تُونے ہم لوگوں پر بڑی دیا کی۔" عورت بولی۔ "تجھے بھگوان نے ہمارے لئے دیوتا بنا کر بھیجا نانڈلا......... میں......... ہم........." وہ بالکل اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ منصور بوکھلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے......... کیا کرے۔

اسی لمحے درمیانی دروازے کا پردہ اٹھا......... اور جو لڑکی اندر آئی' منصور اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس لمحے اس کا ہر دفاعی حصار ٹوٹ گیا۔ وہ وہی لڑکی تھی' جس کا سراپا رات بھر اسے تنگ کرتا رہا تھا۔ وہ ہُوبہو وہی تھی۔ لڑکی بھی متجسس نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں......... اور اٹک کے رہ گئیں۔ کائنات کی ہر چیز ساکت ہو گئی۔ وقت ٹھہر گیا۔ ان دونوں کے لئے اب کائنات میں کہیں کچھ نہیں تھا......... دو آنکھوں کے سوا! ایک دوسرے کی آنکھوں کے سوا!

عورت روئے جا رہی تھی......... اور وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

منصور کے لئے وہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس کے جسم کی تمام توانائی سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھی۔ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا......... بول بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک نظریں نہیں ہٹائے گا' وہ اس کیفیت سے نہیں نکل سکے گا لیکن نظریں ہٹانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ دوسری طرف بغیر کسی وجہ کے اسے یہ یقین تھا کہ لڑکی کا بھی یہی

حال ہے۔ وہ بھی نظریں نہیں ہٹا سکتی۔

بڑی لڑکی کمرے میں آئی تو کسی کو احساس بھی نہیں ہوا۔ اس نے حیرت سے روتی ہوئی ماں کو دیکھا اور بولی۔ "کیا ہوا ماں؟"

اس کی آواز طلسم کشا ثابت ہوئی۔ منجھلی لڑکی نے پلکیں جھپکائیں اور منصور طلسم سے آزاد ہو گیا۔ منجھلی لڑکی نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ "یہ ماں تو ہمیشہ جذباتی ہو جاتی ہے۔" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ "اور جذباتی ہوتی ہے تو رونے لگتی ہے۔"

منصور اس دوران اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ لڑکیاں لباس سے کرسچن لگ رہی تھیں۔ بڑی لڑکی اسکرٹ اور بلاؤز میں تھی اور منجھلی لڑکی گھٹنوں سے کچھ نیچے تک کی پھول دار فراک پہنے تھی۔ دونوں کی پنڈلیاں عریاں تھیں۔ البتہ ان کی ماں خالص ہندو عورت لگ رہی تھی۔ اس نے سوتی ساڑھی باندھی تھی۔ پیشانی پر بندیا تھی اور مانگ میں سیندور.........

"خیر......... جذباتی ہونے کی بات تو ہے۔" بڑی لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر وہ منصور کی طرف مڑی۔ "کل آپ نہ آتے تو نہ جانے ہمارا کیا ہوتا۔"

"اس میں بھی کوئی کمال نہیں۔" منجھلی لڑکی نے کہا۔ "جو کچھ انہوں نے کیا' وہ ان کا فرض تھا۔" اس نے منصور کی طرف اشارہ کیا۔

منصور اس کے لہجے کی شوخی سے بوکھلا گیا۔ "جی......... جی ہاں' وہ تو میرا فرض تھا۔"

عورت چپ ہو گئی تھی۔ اس نے منجھلی لڑکی کو ڈانٹا۔ "میرا......... چپ کر جا۔ یونہی بکواس کئے جاتی ہے۔"

تو اس پیاری لڑکی کا نام میرا ہے۔ منصور نے سوچا۔ کتنا موزوں نام ہے۔ جتنی خوبصورت لڑکی' اتنا ہی پیارا نام۔

"جا......... اس کے لئے کچھ لے کر آ۔ چائے بنا۔" عورت بولی۔

"میں تو نہیں جاتی۔ یہیں بیٹھوں گی۔" میرا نے اکڑ کر کہا اور ماں کے برابر ہی بیٹھ گئی۔

"جا اُوشا' تُو لے آ۔" ماں نے بڑی بیٹی سے کہا۔ وہ میرا کو گھورتی ہوئی کمرے سے

چلی گئی۔

"سنیں آنٹی۔ تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔" منصور نے کہا۔

"آپ کی بات ماں کو سمجھ نہیں آئے گی۔ ماں کی اردو اچھی نہیں ہے۔" میرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہاری اردو تو بہت اچھی ہے۔" منصور بولا۔

"بہت اچھی تو نہیں۔ ماں کے مقابلے میں لگ رہی ہوگی۔ پر میں چاہتی ہوں کہ میری اردو بہت اچھی ہو جائے۔"

ماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "نانڈلا......... تُو بیٹھ۔ میں جرا دیر میں آتی ہوں۔" اس نے منصور سے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

منصور کو اپنے چہرے پر میرا کی نظروں کی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ منصور نے فوراً نظریں ہٹالیں۔ وہ ان آنکھوں کا جادو دیکھ چکا تھا۔ "یہ نانڈلا کیا ہوتا ہے میرا؟" اس نے پوچھا۔

"اس کا مطلب ہوتا ہے' چھوٹا۔" میرا نے بتایا۔ "ماں لاڈ میں شنکر بھائی کو بھی نانڈلا کہتی ہے۔"

"لیکن میں نانڈلا تو نہیں ہوں۔"

"ماں کو آپ پر لاڈ آتا ہوگا۔"

منصور جھینپ گیا۔ میرا اب بھی اسے اسی طرح دیکھے جا رہی تھی۔ ذرا دیر بعد اُوشا ایک ٹرے لے آئی۔ اس نے ٹرے میں سے چیزیں نکال کر میز پر رکھیں' ایک پلیٹ میں چند پوریاں تھیں اور دوسری میں آلو کی ترکاری۔ پھر وہ ٹرے لے کر چلی گئی۔ ماں بھی کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے اصرار کر کے منصور کو پوریاں کھلائیں' پھر اُوشا چائے لے آئی۔ اس دوران ماں منصور سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ وہ اس سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔ منصور کو بھی ان لوگوں کے متعلق خاصی معلومات حاصل ہوگئیں۔ عورت کا نام کلاوتی تھا۔ دو لڑکیوں کے نام اسے معلوم ہو چکے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام بھی اسے معلوم تھا۔ تیسری بہن کا نام تارا تھا۔ سب سے چھوٹی بچی شاردا تھی۔ جو لڑکا اسے بلانے آیا' منوہر تھا۔ اس سے چھوٹا ایک لڑکا شیام تھا۔ گھر کے سربراہ کا نام گردھاری تھا۔

وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ ان کا بڑا بیٹا شنکر ایک اور کمپنی میں اسٹینو تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ آپس میں بے تکلف ہو گئے لیکن منصور کے انداز میں اب بھی جھجک تھی۔ تاہم وہاں بیٹھنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ البتہ وہ میرا کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا اور وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"تُو انجینئرنگ پڑھ رہا ہے رے......... میری میرا کو گڑنتھ سکھا دے نا۔" اچانک کلاوتی نے کہا۔

"گڑنتھ!" منصور نے حیرت سے دہرایا۔

"ماں کا مطلب ہے میتھ میٹکس!" میرا نے وضاحت کی۔

"پڑھا تو دوں لیکن وقت کا مسئلہ ہے۔" منصور نے کہا۔ "یونیورسٹی سے آتا ہوں تو کچھ دیر آرام کرتا ہوں پھر کرکٹ کھیلنے چلا جاتا ہوں۔"

"تو رات کو سہی۔" میرا بولی۔ منصور نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں التجا تھی۔

"ٹھیک ہے آنٹی۔ میں آٹھ بجے آ جایا کروں گا۔ اچھا......... اب میں چلتا ہوں۔"

وہ سب اسے رخصت کرنے دروازے تک آئے۔

☆======☆======☆

دو مہینے گزر گئے۔ منصور اب ان کے گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ بہت محبت کرنے والے لوگ ثابت ہوئے تھے۔ شنکر سے تو اس کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ گردھاری لال بہت خاموش طبع آدمی تھا۔ وہ گھر کے معاملات میں کم ہی دخل دیتا تھا۔ شنکر والے واقعے کا علم اسے گھر والوں کی زبانی ہوا تھا اور وہ بہرحال منصور کا شکرگزار تھا۔ منصور کبھی سوچتا کہ اس گھر کے لوگوں کی محبت میں ان کی غرض یقیناً شامل ہے۔ وہ بستی سے ان کا واحد رابطہ تھا۔ اس واقعے کے بعد ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ گلی کے لوگوں میں بھی گھلیں ملیں۔ ایسے میں منصور ایک ایسے پُل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا' جو اس گھر کو باقی بستی سے ملاتا تھا۔ یہ وہ غرض تھی' جس کے تحت وہ اس سے محبت بھرا برتاؤ کرنے پر مجبور تھے' محبت میں غرض کتنی تھی' اس کا تعین منصور نہیں کر سکتا تھا۔ بہرکیف وہ لوگ اسے اچھے لگتے تھے۔

دوسری طرف میرا اب اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ رات کو وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹتا تو وہ اس کے تصور میں چلی آتی۔ اس تصور میں ایک عجیب سی لذت تھی۔ وہ اس کے تصور سے کھیلتے کھیلتے سو جاتا۔ عرضِ مدعا کا اسے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس لئے کہ اسے مدعا ہی معلوم نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ آخر اس کا حاصل کیا ہے۔ ان کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل تھی۔ وہ مل ہی نہیں سکتے تھے۔ کیسی ستم ظریفی تھی کہ اسے زندگی میں پہلی بار محبت ہوئی تو وہ بھی ہندو لڑکی سے۔ اب عقل اسے بتاتی تھی کہ یہ ایک لاحاصل روگ ہے۔ اسے یہ خیال دل سے نکال دینا چاہئے لیکن دل ضدی بچے کی طرح اسی کھلونے پر اٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی کیفیت اس شعر کے مصداق ہو کر رہ گئی تھی۔

دل وہ بچہ ہے کہ جو چاند کی کرتا ہے طلب
میں وہ ذی ہوش کہ بچے کو بھی بہلا نہ سکوں

کبھی اسے یہ خیال بھی آتا کہ یہ کھیل یک طرفہ ہے اور میرا کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ میں اسے چاہتا ہوں اور ضروری نہیں کہ اس کے دل میں میرے لئے اس انداز کی کوئی گنجائش ہو لیکن یہ خیال پل بھر کا ہوتا۔ اس معاملے میں اس کے اندر ایک واثق یقین موجود تھا۔ یہ یقین کہ میرا اس کے جذبات سے بے خبر بھی نہیں اور یہ کہ میرا کے جذبات اس سے مختلف بھی نہیں۔ وہ یقین اس خیال کو ایک ثانئے میں مٹا دیتا۔

جس روز وہ یونیورسٹی سے جلدی آ جاتا' اس روز وہ پریکٹس سے پہلے ہی میرا کو پڑھانے چلا جاتا۔ اس کے باوجود ٹھیک آٹھ بجے منوہر اسے بلانے آ جاتا۔

"بھیا۔ ماں آپ کو بلاتی ہے۔" وہ کہتا اور کبھی کہتا۔ "میرا دیدی بولتی ہے' ایک سوال سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

شروع میں تو وہ جب میرا کو پڑھانے بیٹھتا تو کمرے میں کوئی نہ کوئی موجود ہوتا۔ زیادہ تر تارا بیٹھی ہوم ورک کرتی رہتی۔ کبھی کلاوتی آ بیٹھتی۔ وہ سویٹر بنتی رہتی۔ سلائیاں متحرک رہتیں۔ وقتاً فوقتاً وہ نظر اٹھا کر اسے اور میرا کو دیکھتی اور پھر سلائیوں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ مگر دو ماہ گزرتے گزرتے یہ احتیاط ختم ہو گئی۔ منصور پہلی بار میرا کے ساتھ اکیلا بیٹھا تو اسے عجیب سی خوشی ہوئی۔ اسے لگا کہ اب اسے قابلِ اعتماد سمجھ لیا گیا

ہے۔ اس سے پہلے اسے وہاں بیٹھ کر پڑھتی ہوئی تارا یا بنائی کرتی ہوئی کلاوتی پہرے دار کی طرح معلوم ہوتی تھیں' جن پر کسی بہت بڑے خزانے کی حفاظت کی ذمہ داری ڈال دی گئی ہو۔

میرا میٹرک میں تھی اور الجبرا میں بہت ہی کمزور تھی۔ منصور کی محنت کے نتیجے میں اب اس کا حساب خاصا بہتر ہو گیا تھا۔ اکیلے بیٹھنے کے باوجود ان کے درمیان کبھی پڑھائی سے ہٹ کر بات نہیں ہوئی۔ منصور تو نظریں بھی کم ہی اٹھاتا تھا۔ اسے میرا کے لباس سے بہت زیادہ الجھن ہوتی تھی۔ وہ کوئی سوال سمجھاتا تو اس کی نظریں کتاب یا کاپی پر جمی رہتیں۔ میرا خود کوئی سوال حل کرتی تو وہ بیٹھ کر اپنی کتاب پڑھنے لگتا۔ ایک کتاب وہ ہمیشہ ساتھ لے کر جاتا تھا لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اسے احساس ہوتا کہ میرا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کی پلکیں لرزنے لگتیں' جیسے اٹھنے کو بے تاب ہوں لیکن وہ خود پہ جبر کئے' کتاب پہ نظریں جمائے بیٹھا رہتا۔ حالانکہ اسے ایک لفظ بھی نظر نہ آ رہا ہوتا۔ کبھی میرا کسی سوال میں الجھی ہوتی تو وہ موقع مناسب جان کر چپکے چپکے اسے دیکھتا رہتا۔ میرا ذرا پہلو بدلتی تو وہ جلدی سے کتاب پر جھک جاتا۔

ایک روز وہ ایسے ہی میرا کو دیکھ رہا تھا۔ میرا کوئی سوال حل کر رہی تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "آپ مجھے چپکے چپکے کیوں دیکھتے ہو؟"

"نہیں تو۔ میں تو کتاب پڑھ رہا تھا۔" منصور نے گڑبڑا کر کہا۔

"یہ میری بات کا جواب نہیں۔ میں نے پوچھا ہے' آپ مجھے چپکے چپکے کیوں دیکھتے ہو؟"

منصور کو حیرت ہوئی کیونکہ میرا اسے دیکھے بغیر' نظریں اٹھائے بغیر یہ بات کہہ رہی تھی۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا؟" اس نے پوچھا۔

"بس.......... پتہ چل گیا۔ مجھے ہمیشہ پتہ چل جاتا ہے۔"

منصور یہ بات سمجھ سکتا تھا۔ اسے بھی تو ہمیشہ نظریں اٹھا کر دیکھے بغیر احساس ہو جاتا تھا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" وہ بولی۔

منصور اس بات کا جواب دے ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جوابی حملہ کرنے کی ٹھانی۔

"اور تم مجھے چپکے چپکے کیوں دیکھتی ہو؟"

میرا نے نظریں اٹھائیں۔ ان بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں حیرت تھی۔ "مجھے معلوم تھا کہ آپ کو بھی پتہ چل جاتا ہے۔" اس کے لہجے میں عجیب سی خوابناکی تھی۔ "لیکن میں آپ کو چپکے چپکے تو کبھی نہیں دیکھتی۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "میں تو آپ کو ماں کے سامنے بھی چھپ کر نہیں دیکھتی۔"

"یہ میری بات کا جواب تو نہیں۔" منصور نے اس کا جملہ اسی کو لوٹا دیا۔

"میں جواب دینے سے کب گھبراتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ "میرا من کرتا ہے آپ کو دیکھنے کے لئے، اس لئے دیکھتی ہوں۔"

منصور حیران رہ گیا۔ اسے اس لڑکی پر رشک آنے لگا۔ جس بات کا جواب دینے سے وہ گھبرا رہا تھا...... بچ رہا تھا، اس لڑکی نے وہ جواب کتنی آسانی سے...... کتنے سادہ لفظوں میں، کتنی سادگی سے دے دیا تھا۔ سچ تو ہے۔ دل چاہے تو کوئی کیا کرے۔ دل کا کہنا تو ماننا پڑتا ہے۔ بچے تو اپنی بات منوا کر رہتے ہیں۔ بچوں کی ضد تو پوری کرنی پڑتی ہے۔

میرا اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ "اتنی آسان سی...... اتنی سچی بات آپ نہیں کہہ سکتے؟"

منصور خاموش رہا۔

"آپ کا من بھی کرتا ہے نا مجھے دیکھنے کو؟"

"ہاں۔" منصور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب تم جلدی سے یہ سوال حل کرو۔"

وہ چند لمحے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ "آپ اتنے بہادر ہو کہ سینکڑوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے ہمارے لئے۔ مگر اتنے ڈرپوک بھی ہو۔" وہ بولی۔

منصور کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "وہ اور بات تھی۔ نہ میں اتنا بہادر تھا، نہ اتنا ڈرپوک ہوں۔ بات ہے موقع محل کی۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "اب تم جلدی سے یہ سوال حل کر کے دکھاؤ۔ مجھے جانا بھی ہے۔"

میرا سر جھکا کر کام میں لگ گئی۔ منصور اسے دیکھتا رہا۔ اب وہ نڈر ہو کر اسے دیکھ

رہا تھا۔ میرا کا ڈرپوک کہنا اسے بہت برا لگا تھا۔

اس روز پہلی بار اس نے میرا کو باقاعدہ ایک لڑکی کی نظر سے دیکھا تھا۔ میرا کا ناک نقشہ بہت اچھا نہیں تھا لیکن رنگ بہت گورا تھا اور آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بے حد شاداب لڑکی تھی۔ پھولوں سے لدی شاخ جیسی اور اس روز پہلی بار منصور کی سمجھ میں شادابی کا مفہوم آیا۔ اس کے جسم میں عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی۔ اس لمحے اس کے وجود میں اجنبی سے جذبے جاگے۔ اسے احساس تھا کہ وہ جذبے اس کے ذہن تک...... شعور تک نہیں پہنچ سکے ہیں لیکن وہ انہیں کسی حد تک سمجھ رہا ہے۔ یہ ایسا تھا جیسے کوئی شیرخوار بچہ پہچان نہ ہونے کے باوجود ماں کی طرف لپکتا ہو۔ شاید اسی کو جبلت کہا جاتا ہے۔

کئی دن تک پڑھائی کا سلسلہ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ وہ میرا سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ اسے زبردست لڑکی لگی تھی۔ پچھلی گفتگو میں وہ اس سے ایک ایسی بات کہلوانے میں کامیاب ہو گئی تھی جس کا اعتراف وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یعنی یہ کہ اس کا دل میرا کو دیکھنے کو چاہتا ہے لیکن وہ اسے بے دھڑک دیکھنے سے ڈرتا ہے۔ وہ ایسی لڑکی تھی، جو کچھ بھی کر سکتی تھی۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ منصور کے اپنے اندر گڑبڑ تھی۔

چند روز بعد میرا نے اس کے جذبوں کے سوئے ہوئے پانی میں پھر کنکر اچھال دیئے۔

"آپ تو سچے آدمی ہو۔ ہو نا؟" اس نے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" منصور نے جواب دیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس بے ضرر سوال کے پیچھے بہت کچھ ہے۔ "ویسے میں کوشش کرتا رہتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں۔" اس نے چند لمحے توقف کیا۔ میرا خاموش رہی تو اس نے پوچھا۔ "تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"سوچتی ہوں، آپ سینکڑوں کے سامنے ایک خطرناک سچ تو بول سکتے ہو لیکن ایک بے ضرر لڑکی کے سامنے ایک بے ضرر سچ نہیں بول سکتے۔"

منصور کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ "پتا نہیں، تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"آپ جانتے ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں۔" میرا بولی۔ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں

ٹھوڑی رکھ کر وہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ اچانک اس نے کہا۔ ”کیا یہ جھوٹ ہے کہ آپ کے من میں کوئی بات ہے جو آپ مجھ سے کہنا چاہتے ہو، مگر نہیں کہتے۔“ اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

منصور نے نظریں چرانے کی کوشش کی لیکن یہ آج بھی ناممکن تھا۔ اس نے پچھلی بار کی طرح اب کے بھی دفاع میں جوابی حملہ کیا۔ ”یہ بات تو میں تمہارے لئے بھی کہہ سکتا ہوں۔ تمہارے دل میں مجھ سے بھی پہلے سے کوئی بات ہے، جو تمہیں مجھ سے کہنی ہے۔ لیکن تم نے نہیں کہی۔“

اس بار میرا بری طرح چونکی۔ ”یہ آپ کو کیسے پتہ کہ میرے دل میں آپ سے پہلے سے کوئی بات ہے؟“

”نہ جانے کیسے.......... مگر بس مجھے معلوم ہے۔“ منصور نے جواب دیا۔

میرا پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ”تو آپ بھی مجھے ویسے ہی سمجھ لیتے ہو، جیسے میں آپ کو سمجھ لیتی ہوں۔“ اس نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔ ”مگر میں اپنے من کی بات کہنے سے نہیں ڈرتی، ایک وجہ ہے جو مجھے روک دیتی ہے۔“

”وجہ میرے پاس بھی ہو سکتی ہے۔“ منصور نے کہا۔ وہ اس کھری اور بے باک لڑکی سے ذہانت کے بل پر لڑ رہا تھا۔ ”اور تم بھی بہرحال ڈرتی ہو۔“

”ہاں۔ میں ڈرتی ہوں۔“ میرا نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں دھرم سے نہیں ڈرتی، سماج سے نہیں ڈرتی، گھر والوں سے نہیں ڈرتی، آپ سے نہیں ڈرتی۔ صرف اس بات سے ڈرتی ہوں کہ میرا سچ آپ تک پہنچتے پہنچتے جھوٹ نہ بن جائے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”دیکھو۔ ہم سب کا آپ سے ایک غرض کا رشتہ ہے، لیکن میں سب میں شامل نہیں۔ میرا آپ سے غرض کا رشتہ نہیں۔ میں آپ سے ایک بہت بڑی بات کہوں گی تو وہ چھوٹی ہو جائے گی اور میں اس بات کو چھوٹا نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں کچھ کہوں گی تو آپ سمجھو گے کہ میں آپ سے تحفظ خرید رہی ہوں۔“

منصور کو حیرت ہوئی۔ میرا کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ ہرگز نہیں تھی لیکن وہ

بہت بڑی.......... بڑی گہری باتیں.......... آسانی سے.......... بڑوں کے انداز میں کہہ دیتی تھی۔

”میں سیدھی بات کرتی ہوں۔“ میرا اپنی کہے جا رہی تھی۔ ”مجھے بات گھما پھرا کر کرنا نہیں آتا۔ مجھے آپ سے تحفظ خریدنا ہوگا تو میں آپ کو بول دوں گی کہ مجھے اور میرے گھر والوں کو پروٹیکشن دو، میں اس کے بدلے..........“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ ”مگر وہ بیوپار ہوگا۔“

”ضروری نہیں کہ میں تمہاری بات کو غلط سمجھوں۔“ منصور نے کہا۔

”لیکن چانس تو ہے نا غلط سمجھنے کا۔“

”اور اگر میں تمہیں یقین دلا دوں کہ غلط نہیں سمجھوں گا۔“

”تو میں آپ سے من کی بات کہہ کر شانت ہو جاؤں گی۔“ میرا نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے۔“

”بس تو پھر اپنے دل کی بات کہہ دو۔“

میرا کی نظریں جھک گئیں اور چہرہ اتنی تیزی سے گلابی ہوا کہ منصور حیران رہ گیا۔ یہ لڑکی ہے کہ حیرت کدہ۔ اتنے تضادات! اتنی بولڈ اور اتنی شرمیلی! وہ کاپی پر سر جھکا کر لکھنے میں مصروف ہو گئی لیکن چہرے پہ شمعیں جل رہی تھیں۔

”بولو نا۔“ منصور نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ ”کیا کہنا ہے تمہیں؟“

”زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ پہلی بار تو نہیں کہہ سکتی۔“ میرا نے نظریں جھکائے جھکائے کہا پھر اس نے کاپی بند کی اور منصور کی طرف بڑھا دی۔ ”من کی بات اس پر لکھ دی ہے۔ آپ پڑھ لو۔ میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔ اس نے ایک بار بھی نظر نہیں اٹھائی تھی۔

منصور نے اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کاپی کھولی اور اوراق الٹنے لگا۔ وہ حساب کی کاپی تھی۔ درمیان میں ایک صفحے پر تحریر دیکھ کر اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے بے تابی سے عبارت پڑھی۔ لکھا تھا۔ ”من کے دیوتا! میں آپ سے اس پل سے پریم کرتی ہوں، جب آپ کو پہلی بار دیکھا تھا، مگر آپ تو جان کر بھی نہیں جان سکتے کہ پریم کیا ہوتا ہے۔“

"سوں چھے نانڈلا۔ ٹھیک تو چھے۔"

منصور نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے کلاوتی کھڑی تھی۔ عام طور پر وہ بے ساختہ گجراتی بول جاتی تھی۔ منصور نے گھبرا کر کاپی بند کر دی۔ "کچھ نہیں آنٹی۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"لگتا تو نہیں۔ میرا بولتی تھی تیرے سر میں درد ہے۔ میرا چائے بنا رہی ہے تیرے لئے۔"

"جج......... جی ہاں۔ سر میں درد تھا کچھ۔" منصور نے گڑبڑا کر کہا۔ میرا نے تو اسے مروا ہی دیا تھا۔ اسے بتائے بغیر سر کا درد تشخیص کر دیا تھا۔

"میں شیام کو بھیج کر ڈسپرین منگاتی ہوں۔" کلاوتی بولی۔ اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

منصور حیران رہ گیا۔ غرض اپنی جگہ لیکن غرض میں کوئی کسی کے لئے اتنا بے ساختہ پریشان نہیں ہوتا۔ کلاوتی کے انداز میں ممتا بھری محبت تھی اور ممتا وہ نعمت تھی، جس سے منصور محروم رہا تھا۔ "ارے آنٹی......... اس کی ضرورت نہیں۔ معمولی سا درد ہے۔ بس چائے سے ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

"تُو چپ کر۔ پہلے دو ڈسپرین کھانا۔" کلاوتی نے اسے پیار سے ڈانٹا۔

میرا چائے لے کر آئی تو پہلے جیسی میرا تھی۔ اس نے چائے کی پیالی منصور کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "لو......... اسے پیتے ہی سر کا درد بھاگ جائے گا۔"

اتنے میں شیام ڈسپرین لے آیا۔ کلاوتی نے پانی کے گلاس میں دو ڈسپرین ڈال کر کہا۔ "لے نانڈلا......... پہلے یہ پی جا۔"

منصور نے پانی پیا۔ کلاوتی گلاس لے کر چلی گئی تو اس نے میرا پر آنکھیں نکالیں۔

"یہ کیا شرارت تھی! مجھے مفت میں ڈسپرین لینی پڑ گئی۔ اب ہو گا سر میں درد۔"

"مفت میں کیوں۔ قیمت ادا کی ہے آپ نے۔" میرا نے شوخی سے کہا۔ "مفت تو کوئی چیز نہیں ملتی۔ پریم سی دولت دو ڈسپرین میں ملی ہے آپ کو۔ سستے چھوٹ گئے۔"

منصور سر جھکائے چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔

"اب آپ بھی اپنے من کی بات کہہ دو۔" میرا نے پُراشتیاق لہجے میں کہا۔

"بات یہ ہے میرا کہ میرے دل میں کوئی ایسی بات نہیں جسے تم سے کہنا ضروری ہو۔" منصور نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"میرے اندر وشواس ہے کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے۔" میرا کے لہجے میں بے پناہ اداسی تھی۔ "آپ ایک بات بتاؤ۔ ہم لوگ آپ کو کیسے لگتے ہیں؟"

"اچھے لگتے ہو۔ محبت کرنے والے لوگ کسے اچھے نہیں لگتے۔" منصور نے پوری سچائی سے کہا۔

"اور میں؟" میرا نے پوچھا مگر فوراً ہی اس نے رخ بدلا۔ اس کے لہجے میں اب بھی اداسی تھی۔ "آپ ایک اور بات بتاؤ۔ مروت لحاظ نہ کرنا۔ آپ کو مجھ میں کوئی بات اچھی بھی لگی؟ میں کسی بھی اعتبار سے آپ کو پسند آئی؟"

"میرا جواب تمہیں اچھا نہیں لگے گا اور میں دل دکھانے کا قائل نہیں۔" منصور نے کہا۔

"آپ اس کی پروا نہ کرو۔ مجھے بتاؤ۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"مجھے تمہاری بس ایک بات اچھی نہیں لگتی۔" منصور نے یہ کہا اور پہلی بار نظریں اٹھائیں۔ اب وہ میرا کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ میرا کے چہرے پر اداسی تھی مگر اب اس کی آنکھوں میں تجسّس کی چمک بھی تھی۔ منصور نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔

"بلکہ مجھے تمہاری یہ بات بہت بری لگتی ہے۔"

"وہ بات کیا ہے؟" میرا نے پوچھا۔

"وہ ہے تمہارا یہ لباس۔"

"لیکن......... لیکن......... دیکھو نا، میں مسلمان تو نہیں ہوں۔" میرا گڑبڑا گئی۔

منصور کا جواب اس کے لئے بے حد غیر متوقع تھا۔

"میں جانتا ہوں لیکن تم کرسچن بھی نہیں ہو۔ تم ساڑھی کیوں نہیں پہنتیں؟"

"ہائے رام۔ ابھی میں ساڑھی کیسے پہن سکتی ہوں۔" میرا نے حیرت سے کہا۔

"ساڑھی تو عورتیں پہنتی ہیں......... شادی کے بعد۔"

"خیر یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ مگر میں اسکرٹ اور بلاؤز کو ہندوؤں کا پہناوا بھی نہیں سمجھتا۔"

"ہندو لڑکیاں تو یہی پہنتی ہیں۔ اس میں برائی کیا ہے؟"

"یہ............ یہ............ اس میں عریانی ہے۔ دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔" منصور گڑبڑا گیا۔ وہ حجاب محسوس کر رہا تھا۔

میرا چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے مایوس لہجے میں کہا۔ "یہ تو وہ بات ہے جو آپ کو بری لگتی ہے مگر آپ کو مجھ میں اچھا کچھ بھی نہیں لگتا۔ ہے نا؟"

منصور کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔ وہ بچوں کی طرح مایوس نظر آرہی تھی۔ یہ ایک اور روپ تھا اس کا۔ اس کی بے باکی' تیزی و طراری دھری رہ گئی تھی۔ "میں نے یہ تو نہیں کہا۔" منصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے آپ نے ایک برائی بتا دی۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا۔"

"میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا۔ میں نے کہا تھا' مجھے تمہاری بس ایک بات اچھی نہیں لگتی۔"

"مطلب؟" میرا نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

"مطلب یہ کہ باقی سب کچھ اچھا لگتا ہے۔"

اچانک میرا کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے اور وہ بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگی۔

"کیا کرتی ہو' آنٹی آجائیں گی......... سب آجائیں گے۔ مجھے تماشا بنواؤ گی۔" منصور نے اسے ڈانٹا۔

"آنے دو' اس وقت میں بہت خوش ہوں۔ سچ بتاؤ' میں آپ کو اچھی لگتی ہوں؟"

"تالیاں روکو تو بتاؤں گا۔"

اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔ "لو.......... اب بتاؤ۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

"پر آپ نے مجھے اتنا کیوں ستایا؟ سچ.......... مجھے رونا آرہا تھا۔"

"تمہاری بے وقوفی ہے۔" منصور نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بس ایک بات اچھی نہ لگنے کا مطلب صاف ہے کہ باقی سب کچھ اچھا لگتا ہے۔"

"اب میں آپ جیسی عقلمند تو نہیں۔ لفظ تو نہیں پکڑ سکتی۔"

"لفظوں کو غور سے سنا کرو۔ کبھی کبھی لفظوں کے درمیان بہت کچھ چھپا ہوتا ہے۔" منصور نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"اب غور سے سنا کروں گی۔" میرا بولی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں پھر چمکنے لگیں۔ "اب میں نے آپ کا ایک جھوٹ پکڑ لیا۔"

"کون سا جھوٹ؟"

"آپ نے کہا تھا کہ آپ کے من میں کوئی ایسی بات نہیں جو مجھ سے کہنا ضروری ہو۔"

"یہ جھوٹ تو نہیں۔"

"اگر میں آپ کو اچھی لگتی ہوں تو آپ کے من میں ایسی ایک بات ضرور ہوگی جیسی میرے من میں تھی۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میرے دل میں کوئی بات نہیں۔" منصور نے کہا۔ "بات تو ہے لیکن وہ تم سے کہنا ضروری نہیں۔"

"کیوں ضروری نہیں؟"

"بس' وجہ ہے جیسے تمہارے پاس تھی۔"

"میں نے تو وجہ آپ کو بتا دی تھی۔ پھر بات بھی بتا دی تھی۔"

"وجہ میں بھی تمہیں بتا دیتا ہوں۔ جس بات کا کوئی فائدہ نہیں' حاصل نہیں' اسے کہنے سے کیا فائدہ؟"

"فائدہ اور نقصان تو بیوپار میں دیکھا جاتا ہے۔ آپ بیوپاری تو نہیں لگتے۔" میرا نے تند لہجے میں کہا۔ پھر اچانک گڑگڑانے لگی۔ "پلیز.......... ایک بار بول دو۔ میرے کو بس ایک بار بتا دو۔ پھر کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ پلیز.......... پلیز.......... پلیز.........."

"میرا' جو بات جانتی ہو' وہ سننا کیوں چاہتی ہو؟" منصور جھنجلا گیا۔

"سنے بغیر وشواس نہیں ہوتا۔ آپ دیکھو' میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ آپ بس ایک بار بول دو۔" میرا نے آنکھیں بند کر لیں۔

"میرا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" منصور نے کہا اور خود بھی حیران رہ گیا۔ اس نے اتنی روانی سے وہ جملہ ادا کر دیا تھا جسے ادا کرنے کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا

تھا۔ اسے تو وہ جملہ فلموں میں، افسانوں میں بھی برا لگتا تھا لیکن شاید میرا کی طلب بہت شدید...... بہت سچی تھی۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی احساس ہوا کہ اس کے سینے میں میرا کی محبت امنڈ پڑی ہے۔ سمندر جیسی محبت اس کے وجود میں ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ سب کچھ بہا کر لے گئی تھی۔ اب جیسے اس کے اندر محبت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ فلمی کہانی نویسوں اور افسانہ نگاروں نے اس جملے کو پامال کر کے...... سستا بنا کے محبت کرنے والوں پر احسان کیا ہے۔ اب کوئی باوقار شخص...... کوئی سچا آدمی اس جملے کو اس وقت تک کسی سے نہیں کہہ سکتا، جب تک اس کے سینے میں محبت کا سمندر موجزن نہ ہو جائے۔ بلکہ وہ یہ جملہ کہتا نہیں۔ وہ تو اس کے اندر ابھرتا ہے، ہونٹوں پر مچلتا ہے، اور خودبخود ادا ہو جاتا ہے۔ کم از کم اس کا اپنا تجربہ تو یہی تھا۔

میرا نے آنکھیں کھول دی تھیں اور ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں منصور کو اپنے لئے کوئی عجیب...... بے بہا چیز نظر آئی۔ اس مفہوم سے قریب ترین اسے ایک ہی لفظ سوجھا...... پرستش!

بالآخر میرا نے ہی خاموشی توڑی۔ "آپ یہ بات کہنے سے ڈرتے تھے۔ اس لئے کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے کہ ہم مل نہیں سکتے؟"

"ہاں میرا، اور میرا ڈر غلط نہیں۔"

"غلط ہے۔" میرا نے زور دے کر کہا۔ "اس لئے کہ ہم مل سکتے ہیں۔ ہم ملنا چاہیں تو ہمیں ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور نہ بھی ملیں تو کیا ہے۔ جب تک چل سکیں، ہم ایک دوسرے کے ساتھ چل تو سکتے ہیں۔ جب بھاگوں میں بچھڑنا ہوگا، ہنسی خوشی بچھڑ جائیں گے۔ ہمارے پاس ایک دوسرے کے ساتھ گزارا ہوا خوبصورت وقت ہوگا۔ ایسا خوبصورت وقت جو بھگوان صرف نصیب والوں کو دیتا ہے۔ ہم جب بچھڑیں گے تو ہمارے پاس خوبصورت یادیں ہوں گی۔ ان یادوں کے سہارے ہم سات جنم بھی ہنسی خوشی گزار سکتے ہیں۔ کم از کم میں تو گزار سکتی ہوں۔ تمہاری محبت کا ایک پل میرے ایک جنم کے تمام دکھ دھو ڈالنے کے لئے بہت ہے۔"

"میرا...... میرا...... تم ہر بار مجھے حیران کر دیتی ہو۔" منصور نے پوری سچائی سے کہا۔ "یہ سب...... فلسفہ کس نے پڑھایا تمہیں؟"

میرا کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی گہری کالی آنکھیں، لگتا ہر چیز کے پار جا کر وقت کے سمندر کو کھنگال رہی ہیں۔ پھر وہ بولی تو اس کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔ "پتا نہیں کیسے، مگر یہ مجھے معلوم ہے۔ میں ذہین نہیں، تمہاری طرح عقلمند نہیں۔ پر تم نے پوچھا تو میں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ مجھے نہیں پتا کہ جو میری سمجھ میں آئی وہ غلط ہے یا صحیح۔ پر شاید ٹھیک ہی ہے۔ مجھے ابھی میرے من نے بتایا ہے کہ "جب منش کو جیون ملتا ہے تو ساتھ ہی اس کے من کو پریم ساگر بھی ملتا ہے۔ وہ ساگر من کے اندر سویا ہوتا ہے۔ پھر جب کبھی من میں سویا پریم جاگتا ہے تو منش کی سمجھ میں سب کچھ خودبخود آ جاتا ہے" اور......" وہ خاموش ہوئی اور چند لمحے سوچتی رہی۔ "میں تمہارا نام نہیں لے سکتی۔ میں تمہیں پریتم کہوں گی۔" اس نے منصور کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا۔ "تمہیں یہ فلمی لگ رہا ہوگا لیکن یہ من کی بات ہے پریتم۔ تو میں کہہ رہی تھی کہ میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں...... وہ ایک لفظ ہے نا...... کیا ہے بھلا سا...... ہاں، دانائی۔ پریم کی اپنی دانائی ہوتی ہے...... پریم کی، من کی دانائی۔ دماغ کی، سنسار کی دانائی سے بالکل الگ۔ تو پریتم، میرے پاس من کی دانائی ہے۔ وہ مجھے اندر اندر سب کچھ بتاتی...... سمجھاتی ہے۔ مجھ سے باتیں کہلواتی ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی اور اس نے منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "پریتم...... تمہارے من میں ایسا کوئی خیال تو نہیں کہ میں کوئی گھاگ لڑکی ہوں اور مجھے سب کچھ پہلے سے معلوم ہے؟"

منصور کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کے دل میں ایک لمحہ پہلے یہی خیال آیا تھا۔

"ہاں میرا، میں نے ایسا سوچا تھا۔"

"میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گی۔ بس ایسا کچھ بھی نہ سوچنا میرے بارے میں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، میرا سب کچھ تم سے شروع ہے اور تم ہی پر ختم۔ نہ اس سے آگے کچھ، نہ اس سے پیچھے کچھ۔"

منصور تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ بن سوچے، بن مانگے محبت ملے اور اتنی ملے تو آدمی کہاں جائے۔ وہ اس وقت محبت کے ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا تھا۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

اس رات کوئی میرا کی کاپی چیک کرتا تو حیران رہ جاتا۔ اس روز اس نے کوئی سوال

حل نہیں کیا تھا۔ ایک سادہ صفحے پر تاریخ لکھی تھی اور بس۔ نچلا آدھا صفحہ کاپی سے پھاڑ لیا گیا تھا۔

☆======☆======☆

منیر نے آنکھیں پھاڑ کر نیچے پڑے پتوں کو دیکھا اور منصور پر آنکھیں نکالیں۔ "یہ حکم کا پتا کہاں سے نکل آیا؟"

"کیا مطلب؟" منصور نے کہا۔ "میرے پاس تو ابھی ایک حکم اور بھی ہے۔"

"دو ہاتھ پہلے تم حکم کاٹ کر گئے ہو۔" نصیر نے کہا۔ وہ منیر کا پارٹنر تھا۔

"ناممکن۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ارے بھائی......... میرا حکم کا بادشاہ تھا جسے تم نے ٹرمپ کیا تھا۔" منیر نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

"منیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شہزاد نے تائید کی۔ وہ منصور کا پارٹنر تھا۔

"تو پتے چیک کر لیتے ہیں۔" نصیر بولا۔ "یہ اپنے بنے ہوئے ہاتھ اِدھر لاؤ۔" اس نے پتے اٹھائے اور چیک کرنے لگا۔ "یہ دیکھو۔" ایک لمحے بعد اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "یہ حکم کا بادشاہ ہے۔ اس پر میں نے اور شہزاد نے حکم دیا ہے اور تم نے ترپ کے چھکے سے اسے کاٹا ہے۔"

"حیرت ہے یار۔ مجھ سے ایسی غلطی کیسے ہو گئی۔" منصور نے بے بسی سے کہا۔ اسے اب بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے حکم پر ترپ لگائی تھی۔

"غلطیاں تو ہوں گی۔" شہزاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم روگ ہی ایسا لگا بیٹھے ہو۔"

"کیسا روگ؟ کیا مطلب؟"

"یار، اب دوستوں سے تو نہ چھپاؤ۔ وہ اس ہندو لڑکی سے تمہارا چکر نہیں چل رہا ہے۔"

منصور گم صم سا ہو گیا۔ وہ جمعے کی شام تھی۔ وہ کرکٹ میچ کھیل کر آیا تھا اور نہا دھو کر لباس تبدیل کر کے دوستوں کے ساتھ ترپ چال کھیلنے بیٹھا تھا۔ یہ تینوں اس کے بچپن کے دوست تھے۔ قدرتی طور پر ان کے درمیان بے تکلفی بہت تھی۔ اتفاق کی بات کہ ان تینوں کو ہی کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"لو بھائی، اسے تو سانپ ہی سونگھ گیا۔" شہزاد نے کہا۔

"ابے اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔" نصیر نے اسے ہلاتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے، پتھر میں جونک تو لگی۔ اے بھائی، اس منیر کو دیکھ، ہر ہفتے نیا عشق چل رہا ہوتا ہے۔ تو نے تو ابھی کیریئر کا آغاز کیا ہے بس۔"

منصور اب بھی گم صم بیٹھا تھا۔ چاروں دوست تاش کھیلنا بھول گئے تھے۔

"اور بھائی......... ہندو لڑکی سے عشق میں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔" شہزاد بولا۔ "نقصان کا کوئی ڈر ہی نہیں۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" منصور پہلی بار بولا۔

"مطلب صاف ہے۔ ہاتھ صاف کر دے اس پر۔ ان ہندوؤں کی طرف ہمارا بڑا حساب نکلتا ہے۔"

"یار......... تم سنجیدہ ہو؟" منصور نے شہزاد سے پوچھا۔

"ایک سو دس فیصد سنجیدہ ہوں میں۔ یہ مذاق کی بات ہی نہیں۔" شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔

"یار شہزاد، مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔" منصور نے دل گرفتگی سے کہا۔ "اتنی سنجیدگی سے اتنی گھٹیا بات کی ہے تم نے۔"

"لو میں ایک بڑھیا بات بتاؤں۔" نصیر بولا۔ "اسے مسلمان کر کے اس سے شادی کر لے، ثواب کا ثواب، مزے کے مزے۔"

"یعنی چپڑی اور وہ بھی دو دو۔" منیر نے ٹکڑا لگایا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے.........."

منیر نے منصور کی بات کاٹ دی۔ "یار منصور، سچی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ہی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"مشوروں کا شکریہ۔" منصور نے خشک لہجے میں کہا۔ "اب میں تم سے التجا کروں گا کہ آئندہ مجھ سے اس موضوع پر کبھی بات نہ کرنا۔"

وہ تینوں سنجیدہ ہو گئے۔ شہزاد نے کہا۔ "ہمارے درمیان ایسا کبھی نہیں ہوا۔ یہاں تو دلیل سے قائل کرنے کا رواج ہے۔ قائل کر دو، پھر ہم کچھ نہیں کہیں گے۔"

"ہاں۔ اب تک یہی ہوتا آیا ہے۔" نصیر بولا۔

منصور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے شہزاد کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "تو ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے میں تمہاری بے ہودہ تجویز پر بات کرتا ہوں۔"

"مجھے اس پر اعتراض ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "پہلے میری تجویز کو بے ہودہ ثابت کرو۔"

"بھائی......... خدا کے لئے اسے قومی اسمبلی کا اجلاس مت بناؤ۔" منیر' شہزاد کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ تو خود بخود ثابت ہو جائے گی۔" منصور نے سنجیدگی سے کہا۔ "بات یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف ہمارا جو حساب نکلتا ہے' وہ انفرادی نہیں' قومی معاملہ ہے اور قومی معاملات قومی سطح پر قوموں کے درمیان طے پاتے ہیں۔ شہزاد صاحب' تمہارا خیال ہے کہ ایک ہندو لڑکی کو بے آبرو کرنے سے اس حساب کتاب میں کمی آ جائے گی......... یا ایک لاکھ تیس ہزار دو سو اٹھارہ لڑکیوں کو بے آبرو کرنے سے اور تین لاکھ چھپن ہزار آٹھ سو نوے ہندوؤں کو قتل کرنے سے وہ حساب بے باق ہو جائے گا۔" اس نے سر اٹھا کر شہزاد کو دیکھا۔ شہزاد کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ٹھہر جاؤ۔ مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ حساب برابر کرنا جاپانیوں سے سیکھو۔ اس اعتبار سے وہ بڑی قوم ہیں۔ اب اس بات سے شاید تمہاری قومی حمیت کو ٹھیس پہنچے گی لیکن یہ حقیقت ہے۔ دیکھو' امریکا نے نہ جھکنے والے جاپانیوں کو ایٹم بم کے زور پر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ جاپانیوں کو ان سے ہیروشیما اور ناگاساکی کا انتقام لینا تھا۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ قدرتی وسائل سے محرومی کے باوجود انہوں نے صنعتی میدان میں اتنی ترقی کی کہ امریکا اور یورپ کو صنعت کے معاملے میں ان کی اپنی مارکیٹ میں مفلوج کر دیا۔ ان کی معیشت تباہ کر دی۔ یہ ایک قوم کا دوسری قوم سے......... بلکہ قوموں سے انتقام ہے اور یہ ہے بڑی سوچ کا نتیجہ۔ چھوٹی سوچ رکھنے والے کبھی حساب برابر نہیں کر سکتے۔ وہ خسارے ہی میں ہوتے ہیں۔" اس کا لہجہ کاٹ دار ہو گیا۔ وہ شہزاد کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ "یہ تو تھی دلیل کی بات۔ اب مذہب کی رُو سے دیکھو۔ تمہاری تجویز پر جو کوئی بھی عمل کرے گا' وہ

ہندوؤں کا حساب تو کیا چکائے گا' اپنے نامہ اعمال کو ہی سیاہ کرے گا۔ اب تم خود سوچو۔ تم مجھے ایک بہت بڑے گناہ کی ترغیب دے رہے تھے' بولو' تم اب بھی اپنی تجویز پر اصرار کرو گے؟"

"نہیں یار منصور' میں غلطی پر تھا۔" شہزاد نے شرمندگی سے کہا۔ "آئی ایم سوری......... رئیلی سوری ڈیئر' میں اپنی تجویز سے شرمندگی سے دستبردار ہوتا ہوں۔"

"لیکن میری تجویز میں ایسی کوئی خرابی نہیں۔" نصیر بولا۔ "اس کے متعلق کیا کہتے ہو؟"

"ٹھیک ہے۔ اب میں اس طرف آتا ہوں۔" منصور نے کہا۔ اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ "اس میں بھی قباحت ہے۔ شادی کو میں دراصل صرف انسان کا ذاتی معاملہ نہیں سمجھتا۔ اس سے اس کے آباؤ اجداد کا......... اور ان سے بڑھ کر آنے والی نسلوں کا تعلق ہوتا ہے۔ میں مسلمان ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے بچے بہت اچھے مسلمان ہوں اور اس کے لئے ہمارے مذہب نے عورت کو بجا طور پر اہم قرار دیا ہے۔ مسلمان ماں کی اہمیت بہت زیادہ ہے' اس کی کارکردگی اچھی ہو یا بری' آنے والی نسلوں کو بہرحال متاثر کرتی ہے.........."

"لیکن تم میرا کو مسلمان کر سکتے ہو۔" نصیر نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ ضروری نہیں' میرا مسلمان ہو جائے اور اگر میری محبت میں وہ ایسا کر بھی لے تو اس میں خلوص کی کمی ہوگی۔ یہ تو غرض سے ایمان لانا ہوگا۔ ایسے میں وہ میرے بچوں کو اچھی تربیت دے کر بہت اچھا مسلمان نہیں بنا سکتی اور نسلوں کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ ایک خرابی پیدا ہو جائے تو آگے جاتے جاتے وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس معاملے میں ایسا ہوا تو ذمے دار میں ہوں گا۔"

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ دل سے اسلام قبول کر لے۔" نصیر نے دلیل دی۔

"بالکل ممکن ہے لیکن یقین سے تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ میرا بھی کبھی پورے وثوق سے یہ دعویٰ نہیں کر سکے گی۔ اس لئے کہ یہاں درمیان میں محبت ہی ہے' جو ایک بہت طاقتور جذبہ اور محرک ہے۔ محبت تو آدمی سے کچھ بھی کروا سکتی ہے۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ میرا تمہاری محبت میں اسلام قبول کرلے لیکن بعد میں اس کا دل سچ مچ روشن ہو جائے۔"

"ممکن ہے لیکن یقینی نہیں اور میں اتنے بڑے معاملے میں رسک نہیں لے سکتا۔ دیکھو، میرا مسلمان ہو جائے اور مجھ سے شادی کر لے تو مجھ پر ذمہ داری ہوگی کہ میں اسے اسلامی شعائر سے روشناس کراؤں۔ اسے دینی تعلیم دوں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اسے مکمل تربیت کی ضرورت ہوگی اور بچے کی تربیت آسان ہوتی ہے کہ اس کا ذہن سادہ ٹیپ کی طرح ہوتا ہے، جس پر کبھی کچھ ریکارڈ نہ ہوا ہو۔ حالانکہ میرے خیال میں ایسا نہیں۔ ہر بچہ اپنے ساتھ ایک پس منظر لے کر آتا ہے۔ ماں باپ، ننھیال، ددھیال کے امتزاج سے اس کی فطرت بنتی ہے۔ میرا کو، جو پیدائشی طور پر ہندو ہے اور دیوی دیوتاؤں کو پوجتی آئی ہے، بدل دینا کوئی آسان کام نہیں ہوگا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ انسان کے بس کا کام ہی نہیں۔ صرف اللہ کی ہدایت ہی کسی کو بدل سکتی ہے۔ یار سوچو تو ہندو دھرم دنیا کا سب سے زیادہ غیر منطقی مذہب ہے۔ دلیلوں سے اسے ہزار بار بودا اور غیر منطقی ثابت کیا جا چکا ہے لیکن اس بیسویں صدی میں بھی لوگ معقولیت سے صرفِ نظر کر کے اس دھرم سے چمٹے ہوئے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کے اندر پشت ہاپشت کی تلقین موجود ہے۔ ان کا ذہن اپنے دھرم کی ہر نامعقولیت کو سمجھتا ہے لیکن دل پر پچھلی نسلوں کی تلقین کی مہر لگی ہوئی ہے اور اس مہر کو صرف اللہ توڑ سکتا ہے۔"

"یار......... خدا کے لئے بس کرو۔" نصیر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "اتنی ثقیل تقریر کر ڈالی تُونے۔ بھائی، میں اپنی تجویز سے دستبردار ہوتا ہوں۔"

"یہ غلط ہے۔" منصور نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بات دلیل سے قائل کرنے کی ہو رہی ہے۔ مقابلہ ڈرا نہیں ہو سکتا۔ جوابی دلیل لاؤ، ورنہ ہار مان لو۔"

"بھائی، میں نے ہار مان لی۔ تم باتیں ہی اتنی بڑی کر جاتے ہو کہ دلیل دینے کی ہمت ہی نہیں رہتی۔"

منیر اٹھ کھڑا ہوا۔ "بھائیو......... میں اعلان کرتا ہوں کہ اس مناظرے میں منصور صدیقی کامیاب ہوئے ہیں۔" اس نے اناؤنسر کے سے انداز میں کہا۔

چاروں دوست ہنسنے لگے۔

"اور اس خوشی میں منصور صدیقی ہم سب کو اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلائیں گے۔" منیر نے مزید کہا۔

"وہ تو پلانی پڑے گی۔ ہمارا دماغ پچی کر کے رکھ دیا ہے اس نے۔" نصیر بولا۔

منصور مسکراتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔

☆======☆======☆

ہفتے کے دن منصور میرا کو پڑھانے کے لئے گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ میرا پہلے سے وہاں موجود نہیں تھی۔ پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ درمیانی دروازے کا پردہ ہٹا اور کوئی اندر آیا۔ منصور نے سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھا......... اور اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ میرا تھی......... لیکن ایسی میرا کہ منصور کو آنکھوں دیکھی پر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیرت سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

"ہیلو۔ کہاں کھو گئے آپ؟ کچھ بولو گے نہیں؟" میرا نے شوخ لہجے میں کہا۔

منصور کچھ کہنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ کلاوتی کمرے میں آ گئی۔ "آ گیا نانڈلا۔ کیسا ہے رے؟" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ "تو بھی حیران ہے نا؟ میرا پاگل بھی ہے اور ضدی بھی۔ بولنے لگی' اب میں فراک اسکرٹ نہیں پہنوں گی۔ میں نے بولا' کیوں نہیں پہنے گی۔ بولی' میرا من نہیں کرتا اب قمیض شلوار پہنوں گی۔ میں نے منع کر دیا۔ ہم لوگ کے ہاں شادی سے پہلے کا پہناوا یہی ہے۔ پر پتا ہے' اس نے کیا کیا؟" اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ اس میں کچھ برہمی بھی تھی' پیار بھی تھا۔ "اس نے سارے کپڑے کاٹ کر پھینک دیئے......... تن کے کپڑوں کے سوا۔ میں ہار گئی اس کی ضد سے۔ کپڑا دلا کر لائی۔ اس نے خود سئے ہیں کپڑے۔"

منصور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ خود کو چور سا محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے کچھ کہنا بھی ضروری تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے سر اٹھایا۔ "مگر آنٹی' ایک بات تو ہے۔ میرا بہت اچھی لگ رہی ہے ان کپڑوں میں۔ ہے نا؟" اپنی آواز اسے خود اجنبی سی لگی۔

"اچھی تو لگے گی۔ میری میرا گھنٹری سندر چھے۔" کلاوتی بولی۔ پھر اس نے غور سے منصور دیکھا۔ منصور کا چہرہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ "سوں چھے رہے نانڈلا۔" اس نے

تشویش سے پوچھا۔ "طبیعت ٹھیک ہے تیری؟"

"ٹھیک ہے آنٹی۔ بس سر میں کچھ درد ہے۔"

"میں ڈسپرین منگاتی ہوں اور ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

کلاوتی چلی گئی تو میرا نے کہا۔ "اب تو آپ میرے کو دیکھ سکتے ہو نا؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔" منصور کی بوکھلاہٹ ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔

"پر آپ کے سر میں درد کیوں ہو گیا۔ آپ کو اچھا نہیں لگا میرا یہ کپڑے پہننا؟" میرا نے بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔

منصور نے چونک کر اسے دیکھا۔ "ارے نہیں پگلی۔ میں تو حیران ہوں' تم نے یہ سب کچھ کیسے کیا۔ سردرد کا بہانہ ہے۔ مجھ سے بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔"

میرا کھل اٹھی۔ "تو آپ کو اب میں اچھی لگی ہوں نا؟"

"دنیا میں کوئی کبھی اتنا اچھا نہیں لگا ہوگا' جتنی اچھی تم لگ رہی ہو لیکن یہ سب تم نے........."

"کبھی کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی جو آپ مجھ سے کہو اور میں نہ کروں۔ آپ نے جو بولا' میں نے کر لیا۔"

"لیکن آنٹی نے کیا سوچا ہوگا؟"

"آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے ماں کو بتایا ہے کہ آپ نے مجھے ان کپڑوں سے منع کیا تھا۔" میرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہیں پریتم' آپ پر تو میں کبھی آنچ نہیں آنے دوں گی۔ میں نے ماں کو بولا کہ میں اب یہ کرچنوں والے کپڑے نہیں پہنوں گی۔"

اسی وقت کلاوتی بائی' ڈسپرین اور چائے لے آئی۔

اس روز منصور کا دل میرا کو پڑھانے میں نہیں لگا۔ وہ بار بار میرا کو دیکھتا......... اور سوچتا رہا۔ شہزاد' نصیر اور منیر سے اپنی گذشتہ روز کی گفتگو اسے رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ پھر اس کی سماعت میں میرا کی آواز گونجتی......... کبھی کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی جو آپ مجھ سے کہو اور میں نہ کروں۔ وہ سوچ رہا تھا' یہ لڑکی واقعی میری خاطر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ یہ تو دل سے اسلام بھی قبول کر سکتی ہے لیکن اس خیال سے بھی اسے طمانیت نہ ملتی۔ اس نے دوستوں سے جو کچھ کہا تھا' دل کی گہرائی سے کہا تھا اور سمجھ کر کہا تھا۔ اس کے لئے وہ

بچے بہت اہم تھے جن کے بارے میں اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے نصیب میں ہیں بھی کہ نہیں......... اور ہیں تو کتنے ہیں؟ کتنے بیٹے ہیں اور کتنی بیٹیاں ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ قبل از وقت سوچ رہا ہے لیکن اس کے نزدیک یہ بات تھی بھی ایسی کہ اس کے متعلق قبل از وقت سوچنا ضروری تھا۔

دوسری طرف وہ میرا کو دیکھتا تو اس پر بے ساختہ پیار آنے لگتا۔ سینے میں موج در موج اس کی محبت اٹھتی......... بھرتی۔ سر پر دوپٹہ ڈالے' کرتے شلوار میں وہ اسے بے حد اپنی لگ رہی تھی۔ اس کے اندر ملکیت کا احساس جاگ اٹھا تھا۔

وہ میرا کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرا کی نظریں اٹھیں۔ ایک لمحے کو دونوں کی آنکھیں ملیں۔ پھر میرا نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اس کے رخسار گلابی ہو گئے تھے۔

"ارے......... یہ تمہیں شرمانا کب سے آ گیا؟ پہلے تو تم کبھی نہیں شرمائیں۔" منصور نے حیرت سے کہا۔ "تم تو مجھ سے دیکھنے کی فرمائشیں کیا کرتی تھیں۔"

"آپ پہلے کبھی ایسے دیکھتے بھی تو نہیں تھے۔" میرا نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

"یہ میرے دیکھنے کا نہیں' ان کپڑوں کا کمال ہے میرا۔ دوپٹہ سر پر آ جائے تو لڑکی کو لڑکی ہونے کا احساس ہو جاتا ہے۔"

"سچ مچ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔" میرا بولی۔

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ منصور کی نگاہوں میں وارفتگی تھی اور میرا کی نگاہوں میں حجاب۔ بہتا وقت چپکے چپکے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔

☆======☆======☆

اس روز منصور کے پریکٹیکل نہیں تھے۔ وہ گھر آیا اور کھانا کھا کر میرا کے گھر کی طرف چلا گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے جواب میں اندر سے میرا نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں........." منصور نے جواب دیا۔ وہ حیران تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

میرا نے دروازہ کھول دیا۔ "آ جاؤ پریتم۔"

منصور اندر داخل ہوا۔ میرا نے چٹخنی لگا دی۔ منصور ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ گھر میں اسے سناٹا محسوس ہوا۔ ذرا دیر بعد میرا آئی تو اس نے اس سلسلے میں اس سے استفسار

کیا۔

"سب لوگ گئے ہوئے ہیں۔" میرا نے جواب دیا۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے؟"

"بس شیام ہے۔"

"تو میں چلتا ہوں۔"

"نہیں نا۔ مجھے اسکول سے بہت کام ملا ہے میتھ میٹکس کا۔ انگریزی کا کام بھی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ کروا دو نا۔"

"میں پھر آ جاؤں گا۔ کرا دوں گا۔"

"کب آ جاؤ گے؟"

"جب آنٹی آ جائیں گی۔"

"وہ تو رات تک ہی آئیں گی۔"

منصور پریشان ہو گیا۔ "یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔" وہ بڑبڑایا۔

"گڑبڑ کیا ہو گئی۔ بس آپ مجھے پڑھا دو۔" میرا نے اطمینان سے کہا۔ "ماں لوگ کے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں۔ اکیلے گھر میں اچھا نہیں لگتا۔ مناسب نہیں ہے۔"

میرا نے اسے صوفے پر دھکیل دیا اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔ "بس......... آپ بیٹھ جاؤ چپ چاپ۔ آج مجھے ضرورت ہے تو آنکھیں پھیر رہے ہو۔"

"لیکن میرا........."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ گھر میں شیام تو ہے۔"

منصور نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔ وہ عجیب سی بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ دوسری طرف جب میرا نے اسے صوفے پر دھکیلا تھا تو اس کے ہاتھوں کے دباؤ سے اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ وہ ایک نئی کیفیت سے دوچار تھا' جسے وہ پوری طرح نہیں' البتہ کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ آج اس کی آزمائش کا وقت آ گیا ہے۔

"اچھا' ٹھیک ہے۔ اسکول کا کام لے کر آؤ۔" اس نے کہا۔

"ابھی لائی۔" میرا نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحے بعد وہ اپنا بیگ لے کر واپس آئی اور بیگ میں سے الجبرا کی کتاب نکال کر منصور کی طرف بڑھا دی۔ "ایکسرسائز 4.3 ہے......... فیکٹرز کی۔" اس نے کہا اور بیگ سے اپنی کاپی اور قلم بھی نکال لیا۔

منصور نے کتاب کھول کر مشق 4.3 نکالی۔

"آپ میری ایک بات مانو گے؟" میرا نے اچانک پوچھا۔

منصور نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

"آج پریکٹس پر نہیں جانا۔ یہاں میرے ساتھ ہی رہنا۔" میرا کے لہجے میں التجا تھی۔

"یہ......... یہ تو ناممکن ہے۔"

"کیوں؟"

"لڑکے کیا سوچیں گے؟"

"سوچنے دو۔ میں آپ کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ آپ میرے لئے ایک دن کی کرکٹ نہیں چھوڑ سکتے۔" میرا نے تیز لہجے میں کہا۔

"میرا......... میں انہیں کیا وجہ بتاؤں گا۔ یہ کہوں گا کہ میں میرا کے ساتھ بیٹھا ہوں اس لئے پریکٹس پر نہیں چل سکتا۔" منصور نے بے بسی سے کہا۔ ویسے میرا نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ اس کے کہنے پر اپنا پہناوا چھوڑ بیٹھی تھی اور اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ماں باپ اور گھر والے کیا سوچیں گے۔

"آپ انہیں زبانی کوئی وجہ نہیں بتاؤ گے۔" میرا بولی۔ "آپ کا گھر ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ آپ ابھی ایک پرچے پر لکھ دو کہ ایک ضروری کام سے جا رہے ہو۔ شیام وہ پرچہ گھر رکھ آئے گا۔"

"لیکن میرا........."

"بس، آپ کو میری یہ بات ماننا ہوگی۔" میرا نے تنک کر کہا۔ "اب جلدی سے پرچا لکھ دو۔"

منصور کے لئے وہ دن ہی بے بسی کا تھا۔ "پرچا لکھنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے

کہا۔ "میں نہیں ملوں گا تو لڑکے خود ہی یہ بات سمجھ جائیں گے۔"

"تو پھر اتنی حجت کیوں کر رہے تھے؟" میرا نے اس پر آنکھیں نکالیں۔ منصور خاموش رہا۔ میرا کا لہجہ بجھ سا گیا۔ "میں سمجھ گئی۔ میرے پاس بیٹھنے کو آپ کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہے نا؟"

"نہیں میرا، یہ بات نہیں، تم جانتی ہو کہ مجھے یہاں آنا، تمہارے پاس بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"بات یہ ہے......... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ میرا، دیکھو نا، ہم اکیلے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے........."

"مجھ سے ڈر لگتا ہے؟ میں آپ کو کھا جاؤں گی کیا؟"

"نہیں۔ میرا......... مجھے خود سے ڈر لگتا ہے۔"

"ہاں۔ آپ کو اپنے آپ سے ڈرنا بھی چاہئے۔ میرے حصے کا ڈر بھی آپ کا ہے۔"

"کیا مطلب؟" منصور نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب بعد میں بتاؤں گی اور ایک بات بتاؤں۔ یہ اچھا ہے کہ آپ خود سے ڈرتے ہو۔ خود سے ڈرنے والا آدمی غلط راستے پر نہیں جاتا۔ اسے صرف اس وقت خود پر اعتبار ہوتا ہے، جب وہ سیدھے راستے پر چل رہا ہوتا ہے۔"

"اے میرا......... یہ سب باتیں کون بتاتا ہے تمہیں؟"

"پتا نہیں۔ میرے من میں خودبخود آتی ہیں۔ غلط تو نہیں ہوتیں؟"

"غلط ہوتیں تو مجھے حیرت کیوں ہوتی؟" منصور نے کہا۔ "اچھا......... بہت ہو گئی۔ اب کام کی بات کرو۔ اس ایکسرسائز میں کون سا سوال نہیں آتا تمہیں؟"

"ایک بھی نہیں آتا۔"

"حیرت ہے۔ سارے فارمولے تو میں تمہیں سکھا چکا ہوں۔ اس مشق میں ملے جلے سوال ضرور ہیں لیکن ہر سوال پر ان میں سے کوئی نہ کوئی فارمولا ضرور اپلائی ہوتا ہے، جو میں تمہیں کرا چکا ہوں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ بس مجھ سے کوئی سوال نہیں ہوتا۔"

منصور اسے سوال سمجھانے بیٹھ گیا۔ مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا کا دھیان پڑھائی کی طرف نہیں ہے۔ اس نے ایک دو بار ٹوکا لیکن میرا نے اسے یقین دلا دیا کہ سوال اس کی سمجھ میں آ رہے ہیں۔ سوال سمجھنے کے لئے میرا کاپی پر جھک آئی تھی۔ دونوں کے سر تقریباً ملے ہوئے تھے۔ ایک بار دونوں نے بیک وقت نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ سانسیں گویا سانسوں کو چھو رہی تھیں۔ دونوں نے جلدی سے نظریں جھکا لیں مگر منصور ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ اب اس کے لئے میرا کو سوال سمجھانا تو درکنار خود سمجھنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ دل و دماغ کی' جسم کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ کاپی پر جھکی میرا اسے ایک درخت کی پھلوں سے لدی.......... پھلوں کے بوجھ سے جھکی شاخ کی یاد دلا رہی تھی۔

اسے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یاد کیا آ گیا' ماضی کا وہ پورا منظر اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔

اس کی عمر چھ سات سال رہی ہو گی۔ وہ گلی سے گزر رہا تھا۔ گلی میں ایک مکان کے اندر دیوار کے بالکل ساتھ امرود کا درخت تھا' جس میں امرود ہمیشہ بھر کر آتے تھے۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے اسے ایک شاخ نظر آئی' جو امرودوں کے بوجھ سے گلی میں جھک آئی تھی۔ اتنی کہ کوئی پورا آدمی صرف ہاتھ بڑھا کر امرود توڑ سکتا تھا۔ اس نے ہلکی سی جست لگائی لیکن اس کا ہاتھ سب سے نیچے والے امرودوں سے ذرا پیچھے رہ گیا۔ دوسری بار وہ زیادہ اچھلا' اس کا ہاتھ شاخ تک پہنچا۔ اس نے شاخ کو ہاتھ کی گرفت میں لیا۔ نیچے آتے ہوئے اس کا ہاتھ امرودوں سے ٹکرایا۔ امرود پک چکے تھے۔ تین امرود ٹوٹ کر نیچے گرے۔ وہ امرود اٹھانے کے لئے جھکا اور امرود ہاتھ میں لئے سیدھا کھڑا ہوا تو اسے اپنے قریب ہی اباجان کھڑے نظر آئے۔ اس نے جلدی سے سلام کیا۔ اباجان نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا کر رہے ہو بیٹا؟''

''یہ امرود توڑے ہیں میں نے۔'' اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

''لیکن منصور' یہ تو بری بات ہے۔''

منصور کو یاد تھا کہ اسی گھر کے دروازے پر اس گھر کی خاتون ایک دن ایک لڑکے کو سمجھا رہی تھیں کہ بیٹا' ویسے جتنے چاہے امرود توڑ لو لیکن پتھر مار کر نہ توڑا کرو۔ گھر میں بچے ہیں کسی کے پتھر لگ گیا تو کیا ہو گا۔ چنانچہ منصور نے اسی حوالے سے جواب دیا۔

''لیکن اباجان میں نے یہ امرود پتھر مار کر نہیں گرائے ہیں۔ اچھل کر اس شاخ سے توڑے ہیں۔'' اس نے شاخ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور پتھر مار کر پھل توڑنا بری بات ہوتی ہے۔''

''جو تم نے کیا' وہ بھی غلط ہے بیٹے!'' اباجان نے نرم لہجے میں کہا۔ ''دیکھو' یہ درخت جس کے گھر میں ہے' اسی کا ہے۔ پھل بھی اسی کے ہیں۔ تم ان کی اجازت کے بغیر پھل توڑو گے تو یہ چوری ہو گی اور چوری بری بات ہے۔ ہاں.......... اپنا درخت ہو تو اس پر تمہیں پورا حق حاصل ہو گا۔ جس طرح چاہو' پھل توڑو۔''

منصور کی سمجھ میں بات آ گئی تھی۔ اس نے شرمندگی سے اپنے ہاتھ میں موجود امرودوں کو دیکھا۔ ''تو اباجان' میں ان کا کیا کروں؟ یہیں چھوڑ دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس صورت میں تمہارا جرم اپنی جگہ رہے گا۔ کوئی اور اٹھا کر لے گیا تو یہ تمہاری ذمے داری ہو گی۔ یہ امرود توڑے تو تمہی نے ہیں نا؟''

منصور کا ننھا سا ذہن الجھ گیا تھا۔ ''اباجان' مجھے کیا کرنا چاہیئے؟'' اس نے بے بسی سے پوچھا۔

''بیٹے' میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس درخت کے مالک سے معافی مانگتا اپنی غلطی کی اور امرود انہیں ہی دے دیتا۔'' یہ کہہ کر اباجان چلے گئے۔

منصور انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے امرود کے درخت والے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ منصور نے اسے سلام کر کے کہا۔

''خالہ.......... مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے یہ امرود توڑے ہیں آپ کے درخت سے۔ مجھے معاف کر دیجئے' آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے امرود اس کی طرف بڑھا دیئے۔

''تو بیٹا.......... کوئی بات نہیں۔ یہ تم میری طرف سے رکھ لو۔'' عورت نے کہا۔

''نہیں خالہ' اباجان کہتے ہیں کہ کسی سے کچھ مانگنا یا لینا بری بات ہے۔''

عورت نے ہاتھ بڑھا کر امرود لے لئے۔ ''تم ماسٹر صاحب کے بیٹے ہو نا؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ میرا نام منصور ہے۔''

''ماشاء اللہ' کیسی اچھی تربیت کر رہے ہیں ماسٹر صاحب بیٹے کی۔''

منصور گھر پہنچا تو اباجان گھر پر نہیں تھے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ آئے تو ان کے ہاتھ میں امرود کا ایک پودا تھا جس کی مٹی میں لپٹی ہوئی جڑیں خاکی کاغذ کے ایک لفافے میں چھپی ہوئی تھیں۔ انہوں نے منصور سے کہا۔ ”یہ میں تمہارے لئے امرود کا پودا لے آیا ہوں۔ زمین کھودو‘ اسے لگاؤ۔ ہر روز صبح‘ شام اسے پانی دو‘ اس کا خیال رکھو۔ محنت کرو‘ صبر سے کام لو اور انتظار کرو۔ انشاء اللہ یہ درخت تمہیں بہت میٹھے پھل دے گا اور ہاں.......... ایک وعدہ کرو۔ اس درخت میں امرود آنے تک تم امرود نہیں کھاؤ گے۔ بازار سے خرید کر بھی نہیں۔“

منصور کو اب بھی یاد تھا کہ کتنا عرصہ وہ امرود کھانے کو ترستا رہا تھا اور جب درخت میں پہلی بار امرود لگے تھے تو اباجان نے کہا تھا۔ ”لو بھئی.......... تمہارا درخت پھل دینے لگا ہے۔ اب جیسے چاہو امرود توڑو اور کھاؤ.......... یہ تمہاری اپنی چیز ہے۔“

اور اندر سے سرخ ان امرودوں کا ذائقہ اور مہک منصور کو اب بھی یاد تھی۔ وہ درخت اب بھی پھل دے رہا تھا۔ کہتے ہیں لال امرودوں میں کیڑا بہت آسانی سے لگ جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔

”کہاں کھو گئے پریتم؟“ میرا نے منصور کو چونکا دیا۔

”کچھ نہیں‘ اباجان یاد آ گئے تھے۔“ منصور نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

مشق مکمل کرا کے اس نے کتاب میرا کی طرف بڑھائی۔ کتاب کے تبادلے کے دوران ان کے ہاتھ آپس میں ملے۔ منصور کے پورے جسم میں وہ لمس کرنٹ کی طرح دوڑ گیا۔ وہ لمحہ جیسے ٹھہر گیا۔ کتاب بیک وقت دونوں کے ہاتھوں میں تھی اور دونوں کے ہاتھ آپس میں ملے ہوئے تھے‘ پھر دونوں ہی کے ہاتھ لرزے.......... اور کتاب گر گئی۔ دونوں اسے اٹھانے کے لئے جھکے تو ان کے سر ٹکرا گئے۔ میرا نے لرزتے ہاتھوں سے کتاب اٹھائی اور میز پر رکھ دی۔

”میرا.......... مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔“ منصور نے کہا لیکن اسے خود اپنی آواز اجنبی لگی۔

میرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بدن میں خفیف سی لرزش تھی‘ جو منصور کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس کا اپنا حال بھی عجیب تھا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ وہ

اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ میرا کے جانے کے بعد اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے پانچ بجے تھے۔

میرا اس کے لئے پانی لائی۔ گلاس منصور کے ہاتھ میں دینے کے بجائے اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ منصور کو اس کی وجہ معلوم تھی۔ خود اس کے ہاتھ ابھی تک یوں لرز رہے تھے جیسے ان میں میرا کے ہاتھ کا لمس اب بھی تھرک رہا ہو۔

میرا گلاس رکھ کر جانے لگی تو منصور نے پوچھا۔ ”اب کہاں چل دیں؟“

”آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

منصور خود کو پُرسکون کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ ذرا دیر بعد برابر والے کمرے سے میرا کی آواز سنائی دی۔ ”سانجھ تھی گئی رے شیامو۔ اب اٹھ جا۔ گوشت ترکاری لے آ بازار سے۔“

”اٹھتا ہوں دیدی!“ شیام نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔

کچھ دیر بعد میرا چائے لے آئی اور اس کے سامنے بیٹھ کر خود بھی چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ اب وہ خود پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔ شیام منہ ہاتھ دھو کر تولئے سے خشک کرتا ہوا آیا۔ ”دیدی‘ لاؤ پیسے دو۔ میں بازار جا رہا ہوں۔ بولو.......... کیا کیا لاؤں؟“

میرا نے مٹھی میں دبا سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ”آدھا کلو گوشت۔ دو روپے کا ٹماٹر‘ ہرا دھنیا اور ایک کلو لوکی لے آنا۔“

شیام چلا گیا۔ میرا نے جا کر دروازے کی کنڈی لگا دی۔ پھر وہ دوبارہ اپنی جگہ آ بیٹھی اور چائے کی پیالی اٹھالی۔

منصور سے رہا نہیں گیا۔ ”ارے.......... تم لوگ گوشت کھاتے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں‘ ہم لوگ بکری کا گوشت کھاتے ہیں۔ مرغی مچھلی بھی کھاتے ہیں۔ پر کٹر ہندو ماس بالکل نہیں کھاتے۔“

”مجھے حیرت ہوئی یہ سن کر۔“

”بکری کا گوشت تو انڈیا میں بھی کھاتے ہیں ہندو لوگ۔“ میرا نے چائے کی پیالی

خالی کر کے میز پر رکھ دی۔ "آپ میرے ساتھ برابر والے کمرے میں چلو۔"

"کیوں؟" منصور گھبرا گیا۔

"چلو نا۔ کھا نہیں جاؤں گی آپ کو۔ کچھ دکھانا ہے۔"

وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کمرے میں گیا تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس طرف دیوار کے ساتھ ایک پرانے طرز کی مسہری رکھی تھی۔ مسہری کے ایک طرف اسٹیل کی الماری تھی۔ مسہری کے اس طرف دیوار سے لگی ایک ڈائننگ ٹیبل تھی' جس کے تین طرف پانچ کرسیاں تھیں۔ میز کی چوتھی سائیڈ دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ "آپ یہاں مسہری پر بیٹھو۔ میں ابھی آئی۔" میرا نے دوسرے دروازے سے جاتے ہوئے کہا۔ اس دروازے سے نکلتے ہی بائیں جانب کچن کا دروازہ تھا۔ میرا کچن میں چلی گئی۔

مسہری پر بیٹھنے کے بعد منصور کو ایک حیران کن چیز نظر آئی۔ ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ والی دیوار اور ڈرائنگ روم اور اس کمرے کی مشترکہ دیوار پر دو کیلیں گاڑ کر ایک ڈوری باندھی گئی تھی اور پردہ لٹکا دیا گیا تھا۔ وہ چھوٹی سی تکونی جگہ تھی جو پردے کی اوٹ میں تھی۔ منصور کو تجسّس ہونے لگا۔

میرا کچن سے پیتل کی ایک تھالی لے کر آئی۔ تھالی پر ایک کٹوری رکھی تھی اور ایک پلیٹ تھی' جس پر پچ رنگی مٹھائی رکھی نظر آ رہی تھی۔ تھالی پر ایک ماچس بھی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟" منصور نے پوچھا۔

"دیوا بتی کر رہی ہوں۔"

"یہ دیوا بتی کیا ہوتی ہے؟"

"ابھی دیکھ لینا۔"

میرا نے بڑھ کر تکونے گوشے کا پردہ سرکایا۔ وہاں دیوار پر کافی نیچا ایک کارنس بنا تھا۔ کارنس پر کچھ عجیب الخلقت دیوی دیوتاؤں کی فریم شدہ تصویریں رکھی تھیں۔ کارنس کے نیچے کچھ کٹوریاں رکھی تھیں۔ ایک طرف مٹی کے کچھ چراغ تھے۔ میرا نے تھالی پر رکھی کٹوری سے چراغوں میں تیل ڈالا۔ پھر ماچس اٹھائی اور چراغ جلا دیئے۔ تیل کی کٹوری اور ماچس وہیں چھوڑ کر اس نے وہ جلتے چراغ تھالی پر پلیٹ کے دونوں طرف رکھے۔ کارنس کے نیچے رکھی کٹوریوں میں سے ایک کٹوری تھالی پر رکھنے کے بعد وہ تھالی

اٹھا کر منصور کی طرف بڑھی۔ منصور حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ منصور کے قریب آ کر میرا نے تھالی کو اس کے سینے کی سطح پر رکھتے ہوئے ایک دائرے میں اوپر کی طرف گھمایا۔ وہ تھالی کو اس کے سر سے ذرا اوپر تک لے جا کر اس کے داہنے کندھے سے نیچے لے آتی تھی۔ ایسا اس نے سات بار کیا۔ منصور اس قدر حیران تھا کہ احتجاج بھی نہ کر سکا۔

پھر میرا نے تھالی اس کے پیروں کی طرف رکھی اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ لئے۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن آواز نہیں تھی۔ منصور گنگ بیٹھا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

چند لمحے بعد میرا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے تھالی میں رکھی کٹوری میں اپنے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا ڈالا۔ اس کٹوری میں کوئی سرخ سی چیز تھی۔ پھر میرا نے اسی انگوٹھے سے منصور کی پیشانی سے بالوں کی جڑوں تک لکیر سی کھینچ دی۔ پھر اس نے اس کے پیر پکڑ لئے۔

منصور جیسے کسی ٹرانس سے باہر آ گیا۔ "کیا کرتی ہو میرا' یہ سب کیا ہے؟" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"آرتی اتاری ہے تمہاری۔ پہلے ہر روز بھگوان کی آرتی اتارتی تھی۔ آج تمہاری آرتی اتاری ہے۔ تمہیں بھگوان تو پہلے ہی مان چکی ہوں اپنا۔"

منصور حیران رہ گیا۔ یہ کیسی محبت ہے؟ یہ محبت کا کون سا درجہ ہے؟ اس نے سوچا۔ "اچھا.......... اب ہٹو۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "اور یہ میری پیشانی پر کیا لگایا ہے تم نے؟"

"یہ تلک ہے۔ پلیز.......... اسے ذرا دیر رہنے دو۔ پھر بے شک پونچھ لینا' پھر تمہارے ماتھے پر میرے پیار کا سورج ہمیشہ چمکتا رہے گا۔"

"تو یہ ہے دیوا بتی اور بھگوان کی آرتی کیسے اتارتی ہو تم؟"

"جیسے تمہاری آرتی اتاری ہے۔" میرا نے کہا۔ "بھگوان کی پیشانی دیکھو نا۔"

منصور نے کارنس پر رکھی تصویر کو دیکھا۔ تصویر کے ماتھے پر سرخ نشان چمک رہا تھا۔ "اس کے بعد تم کیا کرتی ہو؟"

"ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ میرا من میت مجھے دے دے۔"

میرا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ بھگوان میری نہیں سن سکتا اس لئے آج تمہاری آرتی اتاری ہے۔ تم سے پرارتھنا کی ہے۔ جانتی ہوں کہ تم مجھے وہ سب کچھ دے سکتے ہو' جو میں چاہتی ہوں۔ تمہارے اختیار میں ہے سب کچھ........"

"یہ کفر ہے۔ میں نہیں سن سکتا۔" منصور نے اسے ٹوک دیا۔ "سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔ بندے کا اختیار تو بس ایک خود فریبی ہے۔ سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ وہ اللہ جسے کسی نے نہیں دیکھا۔ جو ہر جگہ موجود ہے۔ آدمی کے اندر' رگِ جاں سے بہت قریب........ جو سب کچھ سنتا' سب کچھ دیکھتا........ اور سب کچھ جانتا ہے۔ جس سے کچھ بھی چھپا نہیں۔ جو دلوں کا حال بھی جانتا ہے۔ میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں اور پھر یہ تو بتاؤ' تم چاہتی کیا ہو؟"

"مجھے ایک چھوٹا سا گھر چاہئے........ تمہارے ساتھ........ صرف تمہارے ساتھ۔"

"یہ ناممکن ہے میرا!" منصور نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتے؟"

"یہ نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ اس لئے کہ میں بہرحال سچ بولوں گا اور میرا جواب تمہاری دل آزاری کا باعث ہو گا۔"

"پھر بھی۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔"

منصور نے وہ سب کچھ اسے کہہ سنایا' جو دوستوں سے کہا تھا۔ ہر دلیل اس کے گوش گزار کر دی۔

میرا نے افسردگی سے اسے دیکھا۔ "تم نے اپنے طور پر ٹھیک سوچا۔" اس کے لہجے میں بھی افسردگی تھی۔ "اس لئے کہ تم بہت کچھ نہیں جانتے۔ تم ہندو عورت کو نہیں سمجھتے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مختلف قوموں کی عورتوں کی کیا خصوصیات ہیں۔ لکھا تھا کہ ہندو عورت کا خمیر محبت سے اٹھا ہے۔ وہ صرف محبت کے لئے بنائی گئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو کچھ لکھا گیا' وہ کم تھا۔ میں اپنے من کے حوالے سے سمجھ سکتی ہوں۔

مجھے لگتا ہے' محبت ہمارا دھرم ہے۔ پریمی ہمارا بھگوان ہوتا ہے۔ ہم من ہارتے ہیں تو تن' من' دھن اور دھرم سب اسی کے نام کر دیتے ہیں۔ اسی لئے تو میں تم سے کہہ رہی تھی کہ تمہیں اپنے آپ سے بہت زیادہ ڈرنا چاہئے۔ اس لئے کہ میرے حصے کا ڈر بھی تمہارا ہے۔ پریتم' میں سچ کہہ رہی ہوں' آپ کا ہر اشارہ میرے لئے بھگوان کا حکم ہے۔ یہ تو میرے بھاگوں کا کرم ہے کہ میرے من میں آپ جیسے دیوتا پریمی نے پریم جوت جگائی۔ ورنہ جتنا سمے ہم نے اکیلے گزارا ہے' اس میں کچھ بھی ہو جاتا۔ جانتے ہو' ہمارا شرم و حیا کا تصور مختلف ہے۔ دیوتا بے حیائی کو حیا کہے تو میرے لئے وہ حیا کی سب سے بڑی بلندی ہو گی۔ سمجھ رہے ہو نا۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ تم کو اپنے آپ سے بھی ڈرنا ہو گا اور مجھ سے بھی۔ میں آپ کی کوئی بات ٹال نہیں سکتی۔ مجھ سے کوئی ایسی بات کبھی نہیں کہنا' جس پر آپ کو بعد میں پچھتاوا ہو۔ ہاں........ مجھے کبھی کسی بات پر پچھتاوا نہیں ہو گا۔"

منصور کو اپنے قدموں میں بیٹھی اس لڑکی سے خوف آنے لگا۔ اتنی محبت تو آدمی کو تکبر میں مبتلا کر سکتی ہے........ جہنم رسید کر سکتی ہے۔ "اچھا........ اب تم اٹھ تو جاؤ یہاں سے۔" اس نے کہا۔

"ایسے تو نہیں اٹھوں گی میرے بھگوان' پوجا کی ہے آپ کی۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "اپنے ہاتھوں سے مجھے پرشاد دو۔ مجھے آشیرواد دو کہ میری منوکامنا پوری ہو۔"

"پرشاد؟"

"ہاں۔ یہ پوجا کا پرشاد ہے۔" میرا نے تھالی میں رکھی مٹھائی کی طرف اشارہ کیا۔

منصور نے پیچ رنگی برفی کی ایک ڈلی اس کی طرف بڑھائی۔

"ایسے نہیں۔ مجھے اپنے ہاتھ سے کھلاؤ۔" میرا نے کہا اور منہ کھول دیا۔ منصور نے برفی کا ٹکڑا اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔ میرا نے آدھا ٹکڑا کاٹ لیا پھر وہ بولی۔ "یہ تم کھا لو۔"

"یہ میں نہیں کھا سکتا۔" منصور نے کہا۔ "بس اللہ سے دعا ہے کہ تمہاری آرزو ہم دونوں کی بہتری اور عافیت کے ساتھ پوری کرے۔"

"ٹھیک ہے' میں ضد نہیں کروں گی۔"

اسی وقت منصور نے الماری کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ اس کی پیشانی پر تلک بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار پیشانی کی طرف گیا۔ ”ٹھہرو‘ میں صاف کر دیتی ہوں۔“ میرا نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنے دوپٹے سے اس کے ماتھے پر لگے تلک کو صاف کرنے لگی۔ پھراس نے اچانک ہی منصور کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ پھر وہ دوپٹے کے اس کونے کو بے تابانہ چومنے لگی‘ جہاں تلک کا رنگ لگ گیا تھا۔ ”اب تمہارے ماتھے پر میرے پیار کا سورج کبھی غروب نہیں ہوگا۔“ اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”میرا......... میرا......... تمہارے پاگل پن سے مجھے خوف آنے لگا ہے۔“ منصور نے بھڑکتے لہجے میں کہا۔

”پاگل تو تم ہو۔ پیار سے ڈرتے ہو۔ ارے‘ یہ دولت تو بھاگ والوں کو ملتی ہے۔“ میرا نے کہا۔ وہ تھالی اٹھا کر پوجا پاٹ والے کونے میں لے گئی۔ وہاں سے اس نے تیل کی کٹوری اٹھا کر تھالی میں رکھی اور چراغ اور رنگ والی کٹوری کارنس کے نیچے رکھ دی۔ تھالی واپس اٹھا کراس نے پردہ برابر کردیا۔ تھالی لا کراس نے میز پر رکھ دی۔

”آؤ‘ اب کمرے میں چلیں۔“ اس نے منصور کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

دونوں ڈرائنگ روم میں اپنے اپنے صوفے پر آ بیٹھے۔ ”اور بتاؤ‘ کیا پڑھنا ہے؟“ منصور نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ بس باتیں کرنی ہیں۔“ میرا مسکرائی۔

”ابھی کچھ باقی ہے؟“

”بہت کچھ باقی ہے ابھی تو۔ مجھے آپ کو بتانا ہے کہ میں آپ کے لئے اپنا دھرم بھی چھوڑ سکتی ہوں۔ آدھا تو آج ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”وہ تو میں جان گیا ہوں۔“ منصور نے دھیرے سے کہا۔ ”لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسا تم میری محبت کی وجہ سے کرو گی۔ آدمی اللہ کی محبت میں‘ اللہ کے خوف کے تحت اسلام قبول کرے تو بات بنتی ہے۔ نام کا مسلمان بننے سے کیا فائدہ؟“

”تو آپ بھی تو نماز نہیں پڑھتے‘ مگر مسلمان ہو۔“ میرا نے بے ساختہ کہا۔

منصور کی زندگی میں شرمندگی کا ایسا بھرپور لمحہ کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کا سر جھک گیا۔

یہ بات......... اور وہ بھی ایک ہندو لڑکی کے منہ سے۔ میرا نے صاف صاف تو کہہ دیا تھا کہ اسلام قبول کرنے کی صورت میں وہ بھی کم از کم اتنی مسلمان تو ہوگی‘ جتنا وہ ہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

میرا اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ ”آپ کی قسم‘ میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔“ وہ بولی۔ ”میرا تو جی چاہتا ہے کہ آپ نماز پڑھا کریں۔ آپ جانتے ہو‘ ہم......... سارے ہندو لوگ آپ کو نماز کے وقت نماز نہ پڑھتا ہوا دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں۔ میرے گھر کے لوگ بھی‘ اور آپ کے معاملے میں مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔“

منصور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ میرا۔ اب میں انشاء اللہ نماز پڑھا کروں گا۔“

”مجھے بہت خوشی ہوگی......... سچ۔“ وہ بولی پھر افسردہ ہوگئی۔ ”مگر آپ مجھ سے شادی کبھی نہیں کرو گے!؟“

”میں تمہیں بتا چکا ہوں میرا‘ یہ ممکن نہیں لیکن میں تم سے محبت پر مجبور ہوں۔“

”میرے لئے یہی بہت ہے۔“ میرا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”میرے من میں اب کوئی آپ کے سوا نہیں آسکتا۔ میں آخری سانس تک آپ سے محبت کروں گی اور محبت کرنے والے کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ آج کے بعد وہ ہر کام سیکھنے کی کوشش کروں گی‘ جسے آپ ضروری سمجھتے ہیں۔ میں وہ سب کچھ کروں گی‘ جو آپ کو اچھا لگتا ہے۔ میں ویسی بننے کی کوشش کروں گی‘ جیسا آپ اپنی بیوی کو دیکھنا چاہتے ہو۔ میں سب کچھ سیکھوں گی.........“

”کچھ میں بھی سیکھنا چاہتا ہوں تم سے۔“

”میں؟ میں آپ کو کیا سکھا سکتی ہوں پریتم!؟“

”میں تم سے گجراتی سیکھنا چاہتا ہوں۔“

”سچ؟“ میرا کھل اٹھی۔ ”میں ضرور سکھاؤں گی۔“

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ شیام آگیا تھا۔

وہ دن منصور کی زندگی کا یادگار دن ثابت ہوا۔ اس نے اسی روز سے نماز شروع کر دی۔ پنج وقت نماز تو وہ قائم نہ کرسکا لیکن ہر روز دو تین نمازوں کی سعادت اسے بہرحال

مل جاتی تھی۔ اب وہ میرا کو پڑھانے کے دوران عشاء کی نماز کے لئے جاتا تھا۔ میرا اُس کی اس تبدیلی سے واقعی بہت خوش تھی۔

☆======☆======☆

اکتوبر 1985ء

وہ جمعے کی شام تھی...... اور منصور جمعے کو شاردا کو نہیں پڑھاتا تھا' اس لئے شیام اسے بلانے آیا تو اسے حیرت ہوئی۔ "آپ کو ماں بلاتی ہے۔" شیام نے کہا۔

"تم جاؤ۔ میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔" منصور نے جواب دیا۔

وہ اس وقت گھر میں اکیلا تھا اور پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ پودوں کو پانی دینے کے بعد اس نے ہمیشہ کی طرح دروازے کے باہر سے صرف کنڈی لگائی اور میرا کے گھر کی طرف چل دیا۔

ان پانچ برسوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا...... بہت کچھ آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ خود تعلیم مکمل کر چکا تھا اور اب ایک معروف تعمیراتی کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ صرف دو برس میں کمپنی میں اس نے اپنی ساکھ بنا لی تھی۔ وہ ذہین بھی تھا اور محنتی بھی۔ اس میں آگے بڑھنے کی لگن بھی تھی۔ دیانت داری ایک اضافی وصف تھا جو عنقا ہوتا جا رہا تھا۔ اسی لئے کمپنی کے مالکان اسے بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

میرا نے گزشتہ سال بی اے کر لیا تھا اور اب ایک امپورٹ ایکسپورٹ فرم میں اسٹینو گرافر کی حیثیت سے جاب کر رہی تھی۔ تارا نے اس سال بی اے کا امتحان دیا تھا۔ شاردا نویں میں پڑھ رہی تھی اور منصور اسے پڑھاتا تھا۔

پانچ برسوں میں سب کچھ بدل گیا تھا لیکن منصور اور میرا کے معاملاتِ محبت جوں کے توں تھے۔ دونوں کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس عرصے میں میرا کے گھر منصور کا آنا جانا اور بڑھ گیا تھا۔ انہیں تنہائی میں ملنے کے مواقع ملتے رہتے تھے لیکن وہ کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے کی بے تکلفی سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ میرا نے کئی بار شادی کے متعلق بات کی تھی مگر منصور اپنے مؤقف پر قائم تھا۔ ایسی ہی ایک گفتگو کے دوران اس نے میرا سے کہا تھا۔ "میں نے سنا ہے...... اور میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ آدمی کو اپنا مذہب بہت عزیز ہوتا ہے۔ چاہے مذہب سے اس کا تعلق برائے نام ہو۔

چاہے وہ اس پر عمل نہ کرتا ہو لیکن وہ اسے ترک بہرحال نہیں کرتا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے' جب تم اپنا دھرم چھوڑنے کی بات کرتی ہو۔"

"آپ کبھی مجھ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے پریتم۔ سمجھو گے بھی نہیں۔ اس لئے کہ آپ بہت عقلمند سہی مگر آپ کے پاس من کی دانش نہیں ہے۔" میرا نے کہا تھا۔

"پہلی بات اتنی سی تھی کہ مجھے آپ سے پریم ہو گیا تھا...... پہلی نظر میں اور پھر آپ نے...... مگر چھوڑو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اس دن جب وہ لوگ شنکر بھائی کو مارنے آئے تھے اور مار رہے تھے۔ اس دن آپ نہ آتے تو کیا ہوتا؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" منصور نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "کچھ بھی ہو سکتا تھا۔"

"زیادہ امکان تو یہی تھا کہ وہ شنکر بھائی کو مار ڈالتے۔"

"ہاں۔ رحمت دادا کے ہوتے یہ امکان زیادہ تھا۔ رحمت دادا نہ ہوتا تو میرے خیال میں وہ لڑکے شنکر کو مار پیٹ کر چھوڑ دیتے۔"

"اور ایک بات بتاؤں۔ شنکر بھائی کو میرے ہوتے کوئی نہیں مار سکتا تھا۔" میرا عجیب سے لہجے میں بولی۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب یہ کہ میں اپنے گھر میں سب مختلف ہوں۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"

"اس روز میرے جیتے جی وہ شنکر بھائی کو نہیں مار سکتے تھے۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں بڑی ہمت والی ہوں اور کسی سے بھی لڑ سکتی ہوں۔ جان دے سکتی ہوں اور لے بھی سکتی ہوں۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ پہلے میں ماری جاتی پھر شنکر بھائی کو کچھ ہوتا اور یہ بھی طے ہے کہ یہی ہوتا' وہ لوگ شنکر بھائی کو زندہ نہیں چھوڑتے یعنی میں بھی زندہ نہیں بچتی۔"

"تو پھر؟"

"اپنے حساب سے اس پل میرا جیون ختم ہو گیا تھا۔ تب سے میں آپ کا دیا ہوا جیون گزار رہی ہوں۔ تو اس جیون کے مالک آپ ہی تو ہوئے۔ پھر دھرم کیسا؟ میرا تو

دھرم بھی آپ ہو۔ بھگوان بھی آپ ہو۔"

"مگر وہ تو میرا فرض تھا۔ خود تم نے کہی تھی یہ بات۔ میں نے کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا تھا۔"

"فرض تو تھا۔ فرض تو وہ سب مسلمانوں کا تھا۔ ان کا بھی تھا' جو ہمیں مارنے آئے تھے۔ ان کا بھی تھا' جو تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کا بھی جو اسے ٹھیک سمجھتے تھے اور ان کا بھی جو اسے غلط سمجھتے تھے۔ مگر اس فرض کا خیال کسے آیا؟ صرف آپ کو اور سچ یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا تھا' ٹھیک ہو رہا تھا۔ وہاں مسلمانوں کے گھر جلائے جا رہے تھے۔ خاندان کے خاندان قتل کئے جا رہے تھے۔ وہاں والوں کو ہمارے بارے میں بھی سوچنا چاہئے تھا۔ ہم ان کی ذمے داری تھے۔"

"لیکن زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"اس کو چھوڑو۔ آپ خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو۔ خیر......... مجھے پہلی نظر میں آپ سے پریم ہوا۔ پھر آپ نے میری جان بچائی۔ مجھے نیا جیون دیا۔ میں نے آپ کو اپنا بھگوان مان لیا۔ بعد میں' میں مسلسل سوچتی رہی۔ ہمیشہ سوچتی رہی۔ بار بار سوچتی رہی۔ میں نے سوچا' آپ نے جو کچھ کیا' خود سے نہیں کیا۔ اپنے مذہب کے حکم کے مطابق کیا اور سچ یہ ہے کہ آپ بہت اچھے مسلمان بھی نہیں ہو۔ پھر میں نے سوچا اچھے مسلمان کیسے ہوتے ہوں گے اور اسلام کتنا اچھا مذہب ہو گا۔ میں ہندو دھرم کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی رہی۔ یوں میں آہستہ آہستہ بدلتی گئی۔ خود مجھے بھی بعد میں پتہ چلا کہ میں کتنی بدل گئی ہوں۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "ایک اور بات' آپ جانتے تھے کہ میں نے خود پر آپ کو پورا ادھیکار دے رکھا ہے۔ آپ نے کتنی بار میرے ساتھ تنہائی میں گھنٹوں گزارے مگر کبھی مجھے نظر سے بھی میلا نہیں کیا۔ اسکول کی لڑکیوں کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ محبت کرنے والے ذرا سا موقع ملتے ہی محبت کے نام پر لٹیرے بن جاتے ہیں مگر آپ تو ہمیشہ میرے محافظ رہے جبکہ میں آپ کو بہت پہلے ہر اجازت دے چکی تھی۔ آپ کی محبت آپ کے اور آپ کے مذہب کی طرح پوتر تھی۔ میں آپ کو یہ بتا رہی ہوں پریتم کہ اب میری آپ کے دھرم میں دلچسپی صرف آپ کی محبت کی وجہ سے نہیں۔ اور بھی باتیں ہیں' اور بھی سچائیاں ہیں۔" اچانک اس کے لہجے میں دکھ اتر آیا۔ "مگر آپ میرے شریر

کی یہ بھینٹ کبھی سوئیکار نہیں کرو گے۔ آپ سمجھتے ہو کہ میں آپ کی نسلوں میں ملاوٹ کروں گی' خراب کر دوں گی........."

"ایسی باتیں مت کرو میرا۔" منصور نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن میرا دل نہیں مانتا۔"

"آپ دل سے سوچتے ہی کب ہو۔ آپ تو عقل سے سوچنے والے ہو۔" میرا نے دل گرفتگی سے کہا۔ "مگر پریتم' میں ہار نہیں مانوں گی۔ ٹریننگ سکول میں تو مسلمان لڑکیاں تھیں نہیں۔ کالج میں سب مسلمان لڑکیاں ہیں۔ دیکھ لینا۔ میں ان سے سب کچھ سیکھ لوں گی۔"

منصور نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔ وہ میرا کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس کے اپنے مؤقف میں لچک بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

یہ سب کچھ سوچتا' یاد کرتا وہ میرا کے گھر پہنچا۔ گھر میں کلاوتی اور شیام کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کلاوتی کچن میں تھی۔ وہیں سے بولی۔ "نانڈلا......... تو کمرے میں بیٹھ جا۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

منصور کمرے میں جا بیٹھا۔ وہ حیران تھا کہ کلاوتی نے اس طرح اسے کیوں بلوایا ہے۔ ذرا دیر بعد کلاوتی چائے لے آئی۔ "لے نانڈلا' چائے پی۔"

"شکریہ آنٹی' سب لوگ کہاں ہیں؟" منصور نے پوچھا۔

"آج برادری میں ایک بیاہ ہے۔ وہاں گئے ہیں۔"

"آنٹی......... کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں نانڈلا!" کلاوتی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تو پہلے چائے پی لے۔ پھر بولوں گی۔"

منصور کو وہ سب کچھ غیر معمولی لگ رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جیسے تیسے اس نے جلدی جلدی چائے پی۔ جلدی میں اس کے ہونٹ بھی جل گئے۔ "ہاں آنٹی' اب کہئے کیا بات ہے؟"

"بات کچھ بھی نہیں نانڈلا' پر میرے لئے بڑی ہے۔" کلاوتی بولی۔ منصور نے محسوس کیا کہ وہ ہچکچا رہی ہے۔

"آنٹی......... آپ بے فکر ہو کر صاف صاف کہیں۔"

کلاوتی کچھ دیر سوچ میں ڈوبی رہی۔ چہرے کے تاثر سے لگتا تھا کہ حوصلہ مجتمع کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ دیکھ کر منصور کی تشویش اور بڑھ گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بالآخر کلاوتی نے نظریں اٹھائیں۔ "دیکھ نانڈلا' میرا بھگوان جانتا ہے میں نے تجھے بھی اپنے شنکر سے کم نہیں سمجھا۔ تُو میرا بیٹا ہے۔"

"میں جانتا ہوں آنٹی!"

"نانڈلا......... یہاں ہندو لوگ جیادہ نہیں ہیں۔ لڑکیاں جیادہ ہیں' لڑکے کم ہیں۔ جو ہیں ان میں ڈھنگ کے لڑکے بہت ہی کم ہیں' ہمارے ہاں ہیرے جیسی بیٹیاں پتھر جیسے لڑکوں کو دے دی جاتی ہیں......... وہ بھی ہجار نخرے سہہ کر۔ یہ بھاگ ہوتے ہیں ہم لوگ کی بیٹیوں کے۔ کبھی کبھی تو لڑکیاں بیٹھی رہ جاتی ہیں......... عمر بتا دیتی ہیں اور بر نہیں ملتا۔ ابھی دیکھ' میری اُوشا بیٹھی ہے۔ بھگوان جانے' بر کب ملے گا۔ پر میری سب سے سندر بیٹی میرا ہے رے۔ اس کے لئے میرا من کڑھتا ہے۔ مجھے سب سے جیادہ اسی کی چنتا ہے۔"

"کوئی رشتہ آیا ہے میرا کا؟" منصور نے پوچھا۔ نہ جانے کیوں اس خیال سے اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔

"نہیں رے۔ اور بات ہے۔ بیٹی کی ماں کی ہجار آنکھیں ہوتی ہیں۔ سمجھ بھی جیادہ ہوتی ہے۔ میں نے پہلے دن جان لیا تھا کہ میرا تجھ سے پریم کرتی ہے۔"

منصور کو لگا زمین اس کے پیروں تلے سرک گئی ہے۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

"پھر میں نے دیکھا' تُو بھی میرا سے پریم کرتا ہے۔ پر یہ بھی جان لیا کہ تُو عجت دار گھر کا لڑکا ہے۔ تُو نے ہماری جان بچائی' ہماری سہائتا کی۔ میں میرا کو جانتی ہوں۔ میری میرا آج بھی پوتر ہے تو صرف تیری وجہ سے۔ مجھے تجھ پر بڑا مان ہے رے نانڈلا۔ میرا وشواس کرنا۔ بھگوان کی کسم نانڈلا........." کلاوتی کی آواز بھرا گئی۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ "میں دھرم کی چنتا کے بنا خود میرا کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیتی۔ بھگوان جانتا ہے' میں جھوٹ نہیں بولتی' میں ایسا ہی کرتی اور جیون بھر میرا کی

طرف سے سکھی رہتی۔ سمجھتی کہ بھگوان نے میرا کے بھاگ جگا دیئے۔ پر نانڈلا' میں مجبور ہوں۔ تیرا اور میرا کا سمبندھ نہیں ہو سکتا۔ ہوا تو میرا گھر لٹ جائے گا۔ ہم کو جاتی سے نکال دیں گے جاتی والے۔ میری کسی بیٹی کو بر نہیں ملے گا اور میرا سوامی......... تیرا انکل مجھے جان سے مار دے گا........."

"مگر آنٹی......... میں نے تو یہ سب کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔" منصور نے لرزتی آواز میں احتجاج کیا۔

"جانتی ہوں۔ پر میرا کو بھی جانتی ہوں۔ وہ جو من میں ٹھان لے' کر کے رہتی ہے۔ آج کل دھرم چھوڑ رکھا ہے اس نے۔ دیوا بتی بھی نہیں کرتی۔ بولتی ہے' میرا من نہیں کرتا ماں۔ وہ سب کا جیون اجاڑے گی۔ مورکھ کہیں کی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

منصور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے آنٹی۔ میں کل سے آپ کے گھر نہیں آؤں گا۔"

"میں ایسا نہیں بولتی رے نانڈلا۔ یوں تو وہ جد پکڑ لے گی۔"

"تو پھر اس مسئلے کا حل کیا ہے آنٹی؟"

"ہم لوگ......... تیرا انکل صدر میں فلیٹ تلاش کر رہا ہے۔ ہم کچھ دن میں یہاں سے چلے جائیں گے۔ دور رہ کر شاید میرا تیرے سپنے دیکھنا چھوڑ دے۔ نہیں چھوڑے تو بھگوان کی مرجی۔ پر تُو مجھے وچن دے......... ایک کرپا کرے گا مجھ پر۔"

"ہاں آنٹی' میں وہاں کبھی نہیں آؤں گا۔"

"نہیں رے۔ تجھے دیکھے بنا تو میں بھی نہیں رہ سکتی نانڈلا۔ تُو آنا......... پر کم آنا۔ جیادہ دیر نہیں رکنا۔ پر وچن دے کہ میرا کو کبھی نہیں بتائے گا کہ میں نے تجھ سے بات کی ہے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں آنٹی کہ میرا کو کبھی پتہ نہیں چلے گا۔" منصور نے کہا۔

"یہاں روج کی طرح آتے رہنا۔"

"آپ بے فکر رہیں آنٹی۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"ایک بات بتا نانڈلا۔ تُو اپنے من سے میرا کا پریم کھتم نہیں کر سکتا؟"

منصور سوچتا رہا' خود کو ٹٹولتا رہا پھر اس نے سر اٹھایا۔ "میں جھوٹ نہیں بولوں گا آنٹی۔ اگر یہ میرے بس میں ہوتا تو میں اب تک ختم کر چکا ہوتا۔ میں اب بھی میرا سے محبت کرتا ہوں آنٹی۔ مگر آپ بے فکر رہیں۔ وہ کچھ نہیں ہوگا' جس سے آپ ڈر رہی ہیں۔"

"بھگوان تیری کرپا کرے نانڈلا۔ بھگوان تجھے سکھی رکھے۔"

منصور بوجھل دل لئے وہاں سے اٹھ آیا۔

☆======☆======☆

اور یہ اس گفتگو کے دو ماہ بعد کی بات ہے۔ نیا سال آگیا تھا اور وہ کوئی عام نیا سال نہیں تھا۔ وہ تبدیلیاں ساتھ لایا تھا۔ گردھاری لال نے صدر کے علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ اس کی فیملی شفٹ ہو رہی تھی۔

وہ جمعرات کی شام تھی۔ تمام بھاری سامان فلیٹ پہنچایا جا چکا تھا۔ صرف کچن کا سامان' چند بستر اور چھوٹی موٹی چیزیں رہ گئی تھیں۔ اگلی صبح انہیں ساتھ لے کر جانے کا پروگرام تھا۔ گردھاری لال' اُوشا' تارا' شنکر اور منوہر کو لے کر فلیٹ چلے گئے تھے تاکہ وہاں سیٹنگ کی جا سکے۔ کلاوتی' میرا' شاردا اور شیام گھر پر تھے۔ انہوں نے رت جگے کا پروگرام بنایا تھا۔ کلاوتی نے منصور سے کہہ دیا تھا کہ وہ رات ان لوگوں کے ساتھ رہے۔ "گھر پر کوئی مرد ضروری ہے۔" اس نے کہا تھا۔ "تیرا انکل تو بے فکر ہو کر چلا گیا ہے۔"

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد منصور نے کھانا کھایا اور گرم چادر کندھے پر ڈال کر میرا کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ کلاوتی نے چلغوزے اور مونگ پھلی منگالی تھیں۔ منصور بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

وہ بہت اداس رات تھی۔ میرا چپ چپ تھی۔ منصور زبردستی ہنسنے بولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ احساس دل کا بوجھ بن گیا تھا کہ یہ قربتوں کے الوداعی لمحے ہیں۔ اس کے بعد ہجر کی لمبی رات! شیام اور شاردا کی فرمائش پر وہ انہیں کہانیاں سناتا رہا۔

ساڑھے دس بجے کے قریب کلاوتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں تو سونے جاتی ہوں نانڈلا' تیرا بستر چھوٹے کمرے میں بچھا دیا ہے۔ آرام سے سو جانا۔" اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں محبت تھی۔ منصور کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔ وہ اسے اور میرا کو ایک دوسرے سے

جی بھر کے باتیں کرنے کا موقع دے رہی تھی۔

گیارہ بجے کے قریب شیام اور شاردا کو جماہیاں آنے لگیں لیکن وہ کہانیوں سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ "جاؤ......... تم دونوں سو جاؤ جا کر۔" میرا نے ہلکی سی خفگی سے کہا۔ "ماں بہت سویرے جگا دے گی۔"

"دیدی تم بھی چلو۔ ماں تمہیں بھی تو جگائے گی۔" شاردا بولی۔

"ماں مجھے نہیں جگا سکتی۔ اس لئے کہ میں سوؤں گی ہی نہیں۔"

"لیکن دیدی.........." شیام نے احتجاج کرنا چاہا۔

"بس چپ چاپ سو جاؤ جا کر۔ نیند نہیں آ رہی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ جماہیاں لئے جا رہے ہو۔"

وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ میرا خاموش بیٹھی فرش کو دیکھتی رہی۔ منصور چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا۔ میرا کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ بہت اداس اور غم زدہ دکھائی دے رہی تھی۔ "میرا......... کچھ بولو گی نہیں؟" منصور نے چپ توڑی۔

"کیا بولوں پریتم۔ بولنے کو کیا رہ گیا ہے؟"

"ابن انشاء کا وہ شعر سنا ہے تم نے۔" منصور نے کہا۔

"پھر ہجر کی لمبی رات میاں' سنجوگ کی تو بس ایک گھڑی
جو دل میں ہے لب پر آنے دو' شرمانا کیا گھبرانا کیا"

"دل کی ساری باتیں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں پریتم' آج تو دل خالی خالی لگ رہا ہے۔ جیسے اجڑ گیا ہو۔" وہ بڑے دکھ سے بولی۔

"کیوں؟ میری محبت نہیں رہی کیا۔ ختم ہو گئی؟"

"ایسی باتیں مت کرو۔ آپ جانتے ہو' یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں' میں نہیں جانتا۔" منصور نے کہا۔ "ہاں......... اب جان جاؤں گا۔ محبت جدائی کی آزمائش سے گزرنے کے بعد ہی ثابت ہوتی ہے۔"

"آپ بڑے بے رحم ہو۔" میرا نے اسے ملامتی نظروں سے دیکھا۔ "مجھے آزمائش سے ڈر لگتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اپنی محبت پر بھروسا نہیں۔"

"خود پر تو بھروسا ہے لیکن ڈر لگتا ہے کہ آپ دور رہ کر مجھے بھول جاؤ گے۔" میرا نے آہ بھر کر کہا۔

منصور چند لمحے سوچتا رہا۔ "ہاں۔ ناممکن بھی نہیں۔" بالآخر اس نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ محبت اور بڑھ جائے۔"

"سچ' بڑے بے درد ہو۔" میرا نے دکھی لہجے میں کہا۔

"بے درد نہیں' حقیقت پسند ہوں۔ جس تجربے سے کبھی گزرا نہیں' اس پر اپنے ردِ عمل کا اندازہ کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو خود تمہارے اعتماد پر حیران ہوں۔"

"اور مجھے اس پر حیرت ہے کہ آپ اپنی محبت پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔"

منصور پھر سوچنے لگا۔ پھر اس نے نظریں اٹھائیں اور میرا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں دل سے نہیں' دماغ سے سوچتا ہوں۔ محبت بھی صرف دل سے نہیں کرتا۔ اس لئے تو شک رہتا ہے خود پر۔"

"آدمی کو اتنا سچا بھی نہیں ہونا چاہئے۔ آپ جانتے ہو کہ آپ سے دور رہ کر میں کتنی دکھی ہوں گی۔ آپ جھوٹ موٹ مجھے آسرا دے دیتے تو میرا دکھ اور بڑھتا تو نہیں۔ اب میرے لئے دو عذاب ہوں گے' ایک آپ سے دور رہنے کا اور دوسرا یہ کہ بھگوان جانے' آپ مجھے بھول تو نہیں گئے۔ یہ آپ نے کیسا ظلم کیا ہے میرے ساتھ۔" وہ شکایتی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "کاش......... میری خاطر ذرا سا جھوٹ بول لیتے آپ۔"

منصور کو واقعی افسوس ہونے لگا۔ اسے میرا پر ترس آنے لگا لیکن اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بات منہ سے نکل چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب میرا اس کی محبت کے معاملے میں ہمیشہ خود کو غیر محفوظ سمجھے گی' لیکن سچ یہ تھا کہ میرا اپنے بارے میں کتنی ہی پُریقین سہی' اس کا یقین سمندر کی ریت پر لکھے لفظ کی طرح تھا' جو کسی بھی وقت مٹ سکتا تھا۔ تیز ہوا کے ہاتھوں بھی اور سمندر کی لہروں کے ہاتھوں بھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خود بھی یہ اذیت اٹھائے گا۔

"آئی ایم سوری میرا!" اس نے دھیرے سے کہا۔ "لیکن سچ تو سچ ہے۔ کچھ عرصے بعد پتہ چل جائے گا کہ ہماری محبت میں کتنی سچائی' کتنی گہرائی ہے۔"

"کتنے عرصے کی بات کرتے ہو آپ!" میرا نے تند لہجے میں کہا۔ "میرا یقین تو جیون

بھر کا تھا اور اب یقین کہاں۔ اب تو ملنے پر ہی یقین آئے گا اور آپ کہہ چکے ہو کہ ہم کبھی ملیں گے نہیں۔ اور آپ......... ایک سال گزر جائے گا تو آپ سوچو گے کہ محبت کا ایک سال زندہ رہنا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ اگلے سال مٹ نہیں جائے گی۔ دیکھو......... یقین تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ یا نہیں ہوتا۔ نہیں ہوتا تو پھر کبھی آتا نہیں۔ محبت میں یقین نہ ہو تو آدمی ذرا سی دیر کی دوری میں موقع ملتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔"

منصور نے سر جھکا لیا۔ میرا سچ کہہ رہی تھی' اس کی بات سمجھ میں آ رہی تھی لیکن وہ کیا کرتا۔ اس کا اپنا سچ اِس سے مختلف تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ میں اب کبھی کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ میں نے........."

اچانک وہ کہتے کہتے رکی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "ہائے بھگوان......... ہائے رام۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "آپ کو اپنی محبت پر یقین نہیں تو میری محبت پر بھی نہیں ہوگا۔ ہے نا؟ دیکھو سچ بولنا۔"

"نہیں میرا' یہ بات نہیں۔"

"اِدھر۔ سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھو......... اور پھر بولو۔" میرا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

منصور نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اب اس کے لئے جھوٹ بولنا ناممکن تھا۔ "سوری میرا' میں تمہیں دکھ پر دکھ دے رہا ہوں۔" اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ "لیکن سچ یہ ہے۔"

"بس اب کچھ نہ بولو۔ میں سمجھ گئی۔ آپ تو خود دکھی ہو۔ آپ کو مجھ پر بھی بھروسا نہیں۔" میرا بولی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی۔ "پر اب آپ چنتا نہ کرو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی۔ آپ کو مجھ پر بھی وشواس آ جائے گا اور خود پر بھی۔ مجھے بھی آپ پر وشواس آ جائے گا۔ آپ بالکل چنتا نہ کرو۔"

"کیا مطلب؟" منصور دنگ رہ گیا۔ وہ بالکل بدل گئی تھی۔ اداسی غائب ہو گئی۔ اب وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں پرانی چہکار بھی لوٹ آئی تھی۔

"بس آپ چھوڑو اس بات کو۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔" میرا نے چہک کر کہا۔

"ایک بات بتاؤ۔ آپ نے مجھ سے جو گجراتی سیکھی ہے' دور رہ کر بھول تو نہیں جاؤ گے۔"

"نہیں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"چلو......... کچھ تو یقین سے کہہ سکتے ہو آپ۔ ہاں' ایک بات اور بتاؤ۔ ماں نے میرے بارے میں کوئی بات تو نہیں کی تھی آپ سے؟"

"نہیں' لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"مجھے لگتا ہے' ماں کو میرے اور آپ کے بارے میں پتہ ہے۔ اسی لئے یہ گھر چھوڑ رہے ہیں ہم۔ ماں نے سوچا ہوگا کہ آپ سے دور ہو کر میں سدھر جاؤں گی۔"

"لیکن فلیٹ تو انکل نے ڈھونڈا ہے اپنی مرضی سے۔"

"نہیں۔ ماں نے بولا ہوگا پپا کو۔"

"ممکن ہے' یہی بات ہو لیکن آنٹی نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"خیر......... ہوگا کچھ۔ مجھے پروا نہیں۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ آج کچھ اچھی اچھی باتیں بھی کرلو۔ دور کا سفر ہے میرا۔ اس میں کام آئیں گی۔"

وہ ایک دوسرے سے وہی باتیں کرنے لگے' جو ساری دنیا کے محبت کرنے والے آپس میں کرتے ہیں۔

کچھ دیر بعد میرا کو جماہیاں آنے لگیں۔ اس نے کلاک میں وقت دیکھا۔

"اوہ......... سوا بارہ بج گئے۔ نیند آرہی ہے۔ آپ یہاں رکو۔ میں آپ کا بستر ٹھیک کرکے آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چھوٹے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آئی۔

"جاؤ......... آپ بھی جا کر سو جاؤ۔ میں نے آپ کا بستر لگا دیا ہے۔"

"مگر مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔"

"جا کر لیٹو گے تو آجائے گی......... گڈ نائٹ جان!"

"شب بخیر۔"

میرا ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی رہی۔ منصور چھوٹے کمرے میں چلا گیا۔ فرش پر گدا بچھا کر اس پر بے داغ سفید چادر بچھا دی گئی تھی۔ پائنتی کی طرف لحاف رکھا تھا۔ منصور نے پلٹ کر میرا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ "آپ کے سرہانے تکیہ وغیرہ رکھا ہے۔ جاؤ' اب لیٹ جاؤ۔ میں بتی بجھا رہی ہوں۔" میرا نے دھیمی آواز میں

کہا۔

منصور بستر پر جا لیٹا۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ اس نے لحاف کھول کر اوڑھ لیا۔ میرا نے تمام بتیاں بجھا دی تھیں۔

منصور کو خاصی دیر نیند نہیں آئی۔ کمرے اور بستر کی نامانوسی اس کے لئے الجھن کا باعث تھی۔ پھر وہ میرا کے رویئے اور انداز میں اچانک تبدیلی سے بھی الجھ رہا تھا۔ میرا کا یہ کہنا کہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب ٹھیک کرلوں گی......... اب آپ چنتا مت کرو......... اس کا کیا مطلب تھا آخر۔ وہ غور کرتا اور الجھتا رہا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

لیکن نیند گہری نہیں تھی۔ اس لئے جیسے ہی کوئی اس کے لحاف میں گھسا' اس کی آنکھ کھل گئی۔ "ک......... کو......... کون ہے؟" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"چیخنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں میرا۔ اور کون ہو سکتا ہے؟" میرا نے اسے ڈانٹا۔

"کیا......... کیا بات ہے؟" منصور اب بھی بوکھلایا ہوا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ بس آپ کو یقین دلانے اور خود یقین حاصل کرنے آئی ہوں۔" میرا نے کہا اور اس سے لپٹ گئی۔

"کیا کرتی ہو۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔" منصور کی آواز لرزنے لگی۔

"اب تو آگئی ہوں۔ آپ مجھے بھگا تو نہیں سکتے۔" میرا نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔

منصور سانس لینا بھی بھول گیا۔ افتاد اس قدر اچانک تھی کہ اس سے سوچا بھی نہیں جا رہا تھا۔ دوسری طرف اس کے اندر......... اس کے وجود میں بھی ایک طوفان مچلنے لگا تھا۔ ایک طوفان باہر تھا اور ایک اندر۔ اس کا وجود' ایک حقیر کشتی کی طرح دونوں طوفانوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ "میرا......... میرا......... خدا کے لئے......... مجھے اتنی بڑی آزمائش میں مت ڈالو۔" وہ گڑگڑایا۔ "میرا......... میرا........."

"آپ نے تو بولا تھا کہ آزمائش کے بعد ہی سچ سچا ثابت ہوتا ہے۔" میرا نے اسے یاد دلایا۔ "مگر آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا بھی کچھ نہیں بگڑے گا اور میرا

بھی۔ آپ سے محبت کرتی ہوں تو آپ سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ جہاں آپ کمزور پڑ گئے' میں مضبوط بن جاؤں گی۔"

اندر کا طوفان زور پکڑ گیا تھا۔ کشمکش بہت کمزور اور موہوم تھی۔ "لیکن میرا میں بہت کمزور آدمی ہوں۔ میرا میں.........."

"آپ ڈرو نہیں......... سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔" میرا نے بچوں کی طرح اسے چمکارا۔ "یہ اپنے ہاتھ لاؤ۔ ان کی آنکھوں سے مجھے اچھی طرح دیکھ لو۔ پوری طرح یاد کر لو مجھے۔" اس نے منصور کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا!

میرا نے جو کہا تھا' کر دکھایا۔ وہ صرف ایک ثانئے کو کمزور پڑا تھا اور اس ثانئے میں میرا نے خود کو مضبوط ثابت کر دیا۔

پھر میرا کا چہرہ اس کے چہرے پر جھکتا چلا آیا۔ زمین کی گردش جیسے تھم گئی۔ کائنات کی ہر چیز ساکت ہو گئی۔

طوفان راستہ بدل کر بستیوں کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر گزر گیا تھا۔ بس ایک موج اٹھی تھی......... اور وہ بھی ایسی کہ سمندر میں پھنسے ہوؤں کو بھنور میں دھکیلنے کے بجائے ساحل پر پہنچ گئی تھی۔

"میرا......... یہ سب........."

"خاموش رہو پریتم!" میرا نے پیار بھری خفگی سے کہا۔ "خوبصورتی کو برباد مت کرو۔ آپ نے......... میں نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ بہت خوبصورت سفر کیا ہے ساتھ ساتھ۔ یہ سب کچھ اپنے دل......... دماغ پر نقش کر لو۔ بولو گے تو سب مٹ جائے گا۔"

منصور نے اپنے اندر جھانکا۔ جو کچھ ہو چکا تھا' اسے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سب کچھ واقعی بہت خوبصورت تھا۔ ایک کمزور ثانئے کے سوا اس میں کہیں آلودگی کا شائبہ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود کو بہت آسودہ محسوس کر رہا تھا لیکن وہ کمزور ثانیہ! اس لمحے ایسا محسوس ہوا تھا کہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ مگر......... مگر میرا نے اسے بچا لیا تھا۔ اس ایک پل کو یاد کر کے اُس کے دل میں میرا کے لئے شکرگزاری ابھری۔ اس نے بے حد محبت سے میرا کے سر کو تھپتھپایا جو اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

میرا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "پیار آ رہا ہے مجھ پر؟"

"ہاں میرا' آج تم نے مجھے بچا لیا۔" منصور نے کہا۔

"لیکن آزمائش میں ڈالا بھی تو میں نے تھا۔ اور پھر آپ تو ہمیشہ مجھے بچاتے آئے ہیں۔"

"پھر بھی.........."

"میں نے کہا تھا نا کہ جہاں آپ کمزور پڑو گے' وہاں میں مضبوط ہو جاؤں گی۔"

"میں تمہارا شکرگزار........." منصور کہتے کہتے رک گیا۔ اچانک ہی ایک خیال نے اسے اندر سے لرزا دیا تھا۔ اس نے سوچا' یہ میں کس انداز سے سوچ رہا ہوں۔ میں تو اس مذہب کا ماننے والا ہوں' جس میں کسی نامحرم کو ایسی کیفیت میں چھو لینا بھی گناہ ہے اور میں بھی میرا کی طرح سوچ رہا ہوں کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ درست ہے کہ ہم ایک گناہ کبیرہ سے بچ نکلے لیکن گناہ تو ہم نے پھر بھی کیا۔ آہ......... میں ترغیب سے بچ نہ سکا۔

میرا اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا تاثر اسے بہت کچھ بتا گیا۔ "کیا بات ہے پریتم؟" اس نے پوچھا۔

"میرا' ہم دونوں گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ بہت برا ہوا میرا!"

"لیکن پریتم' ہم نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔" میرا کی سرگوشی میں دبا دبا احتجاج تھا۔

"جو کچھ ہم نے کیا' ہمارے دین میں وہ بھی گناہ ہے۔" اب وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ "ہم ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہیں۔ اس کے باوجود ہم نے ایک دوسرے کو چھوا۔ یہ گناہ ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اللہ دلوں کے حال جانتا ہے۔ نیتیں اس پر روشن ہیں۔ شاید یوں ہماری بچت ہو جائے۔ ورنہ گناہ گار تو ہم بہرحال ہو گئے۔"

"میرے خیال میں تو ہمیں گناہ سے بچ نکلنے کا انعام ملنا چاہئے۔"

"ایسی باتیں مت کرو میرا!" منصور نے برہمی سے کہا۔ "میں تمہیں جو سمجھا رہا ہوں' اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اللہ نے انسانوں کے لئے ایک دائرہ بنایا ہے۔ دائرے کے باہر جانا گناہ ہے لیکن جانتی ہو اللہ نے انسانوں کو تلقین کی ہے......... سختی سے منع فرمایا ہے کہ دائرے کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اس لئے کہ انسان کمزور ہے' قریب جائے گا تو کسی کمزور لمحے میں دائرے سے باہر کی دلدل میں اس کا پاؤں

پڑ سکتا ہے۔ حکم ہے کہ خود کو آزمائش میں نہ ڈالا جائے۔"

میرا بہت غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ "تو اب ہم پرائشچت نہیں کر سکتے اس پاپ کا؟"

"ہم توبہ کر سکتے ہیں اور اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ پشیمانی سچی ہو گی اور دل و دماغ میں آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا پختہ ارادہ ہو گا تو وہ آدمی کی توبہ ضرور قبول فرمائیں گے اور توبہ آدمی کو دھو کر پاک کر دیتی ہے......... معصوم بچوں کی طرح........."

میرا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "منصور......... تمہارا مذہب تو بہت اچھی باتیں سکھاتا ہے۔ دیکھو......... میں سچ مچ شرمندہ بھی ہوں اور میں آئندہ کبھی ایسا کروں گی بھی نہیں۔ تو کیا اللہ مجھے معاف کر دے گا؟"

"مگر تم تو اللہ کو مانتی ہی نہیں؟"

"واہ، مانتی کیوں نہیں ہوں۔ آدھی مسلمان تو ہوں میں۔ پوری بھی ہو جاؤں گی ایک دن۔ میں توبہ ضرور کروں گی۔"

"آدھی مسلمان کیسے ہو گئیں تم؟"

"بس ہو گئی۔ بعد میں کبھی بتاؤں گی۔ اب مجھے توبہ کرنے دو۔"

"وہ اکیلے میں کرنا۔ بس مجھے ایک بات بتا دو اور پھر چلی جاؤ۔ یہ سب کچھ تم نے کیوں کیا؟"

"اب تو شرمندہ ہوں اس پر۔ اب کیا بتاؤں۔ میرا جواب میری شرمندگی کے خلاف ہو گا۔"

"مجھے یہ بتاؤ۔ اس وقت تمہارے ذہن میں کیا تھا؟"

"اس وقت میرے خیال میں یہ ضروری تھا۔ اس لئے کہ اتنے برسوں میں، میں آپ کو سمجھ گئی ہوں۔ آپ اب مجھے کبھی نہیں بھولو گے۔ اس لئے کہ آپ نے مجھے اپنی امانت بنا لیا ہے اور اب آپ بھی میری امانت ہو۔ اب مجھے وشواس ہے کہ ہم ایک دوسرے کے سوا کسی کے نہیں ہو سکتے۔ اب مجھے کبھی خیال نہیں آئے گا کہ آپ مجھے بھول گئے ہو اور آپ بھی کبھی ایسا خیال نہ کرنا۔ اب میرا کبھی آپ کے سوا کسی کی نہیں ہو گی۔ سمجھ گئے۔ بس یہ بات ہے۔ مگر اب میں شرمندہ ہوں۔"

منصور کو اس کی سوجھ بوجھ نے حیران کر دیا۔ اس کا تجزیہ واقعی درست تھا۔ اس کی اپنی سوچ یہی تھی۔ "بس اب تم چل دو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"جاتی ہوں۔ پر مجھے بھی کچھ پوچھنا ہے۔ ہمارے گھر آیا کرو گے؟"

"دیکھو میرا۔ اب مصروفیت بہت ہے۔ یہ بہت مشکل ہو گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں کبھی گلہ نہیں کروں گی۔ پر ایک وچن دو مجھے۔ جب بھی میں بلاؤں گی، ضرور آؤ گے۔ ہاں......... میں کسی بڑی ضرورت کے بنا کبھی نہیں بلاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم جب بلاؤ گی، ضرور آؤں گا۔"

"اچھا پریتم، اپنا خیال رکھنا۔" میرا نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ "اب میں جاتی ہوں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"جاؤ میرا، مگر آج کے بعد ایسے نہ رونا۔" منصور نے اداس لہجے میں کہا۔ "سمجھ لینا کہ تم روؤ گی تو مجھے تکلیف ہو گی۔"

میرا چلی گئی۔ منصور کا عجیب حال تھا۔ دل پر بہت بوجھ تھا۔ وہ اٹھا، اس نے باتھ روم میں جا کر ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ تھرتھری چڑھ گئی۔ کمرے میں واپس آ کر وہ بستر پر قبلہ رُو سجدے میں گر گیا۔ "اے اللہ......... مجھے معاف فرما دے۔ غفور الرحیم، معاف فرما دے، میں شرمندہ ہوں آقا، توبہ کرتا ہوں معبود، مجھے معاف فرما دے۔" وہ خدا کے حضور گڑگڑاتا رہا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ لفظ ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ مگر اس کا دل جیسے دھڑکنوں کی زبان میں وہی لفظ دہراتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔

اچانک اسے قرار سا آ گیا۔ دل سے بوجھ ہٹا اور وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ شاید اس کی توبہ قبول فرما لی گئی تھی۔ نہ جانے کب وہ سجدے ہی میں سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر وضو کیا۔ وضو کر کے آیا تو کلاوتی جاگ چکی تھی۔ "اچھا آنٹی......... اب میں چلتا ہوں۔"

"نماز پڑھ کر آئے گا نا؟"

"نہیں آنٹی، آج میچ بھی ہے میرا۔ اب تو میں بس آپ کے نئے گھر آؤں گا کبھی۔"

"اچھا نانڈلا۔ بھگوان تیری رکھشا کرے۔"

منصور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے قدم مسجد کی طرف اٹھ رہے تھے۔

☆======☆======☆

وقت کے بوڑھے مؤرخ کا قلم بہت تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔

میرا ایک بھولا بسرا خواب بن کر رہ گئی تھی۔ محبت کے حصار سے باہر آ کر منصور نے اپنے گردوپیش کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ محبت کے سحر نے اتنے عرصے سے اسے ایک بے خبری کے زنداں میں اسیر کر رکھا تھا۔ وہ آزاد ہوا تو ہر طرف ایک جہانِ حیرت نظر آیا۔ یہاں تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ پرانی اقدار دم توڑ رہی تھیں۔ تہذیب اور تمیز رخصت ہو رہی تھی۔ چھوٹے اپنے بڑوں پر آنکھیں نکالنے اور انہیں بدتمیزی سے جواب دینے کے مراحل سے گزر کر ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کے مرحلے میں داخل ہو گئے تھے۔ ہر دل میں احساسِ محرومی پل رہا تھا اور ہر احساسِ محرومی کا علاج ایجی ٹیشن تصور کر لیا گیا تھا۔ ہر شخص کو ہر دوسرے شخص سے شکایت تھی۔ ہر شخص اپنے حقوق کی بات کرتا تھا......... اور دوسروں کے حقوق سے تغافل برتتا تھا۔ اپنے فرائض کا احساس کسی کو بھی نہیں تھا۔

کوتاہیاں اربابِ اقتدار سے بھی ہوئیں۔ استحصالی معاشرے میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ لوگ صرف اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر سوچتے ہیں۔ باقی سب کچھ ثانوی ہو کر رہ جاتا ہے اور لوگ جب یہ تماشا دیکھتے ہیں تو انہیں بے وقوف بننے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یوں یہ بیماری پھیلتی جاتی ہے اور جو لوگ وسائل سے محروم ہوتے ہیں' انہیں ان کی صلاحیتوں اور اہلیتوں سمیت نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ یوں سینے احساسِ محرومی سے سلگتے رہتے ہیں۔ اندر دھواں بھر جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی شعبدہ گر ایکسپلائٹیشن کی پھکنی سے دوچار پھونکیں مار دے تو سلگتا ہوا احساسِ محرومی نفرت کی نہ بجھنے والی آگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے تشدد کا آغاز ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں انسانوں کو کتا سمجھنے کا رجحان بہت توانا ہے۔ کتے کی دم پر کسی کا پاؤں پڑ جائے تو کتا لازمی طور پر غراتا ہے......... بلکہ کاٹ بھی لیتا ہے۔ ہم بھی......... اور ہمارے حکمراں بھی یہی کلیہ مہذب انسانوں پر آزماتے ہیں۔ صبر کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ کوئی صبر کرے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے کوئی تکلیف نہیں اور تکلیف ہے بھی تو بہرحال قابلِ برداشت ہے' دوا دینا ضروری نہیں۔ ہم تو وہ ہیں کہ اگر

خد۹کتے سے اس کا ردِ عمل' اس کی خصلت اور اس کی جبلت چھین لے اور ہم کتے کی دم پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو جائیں اور کوئی ہمیں ٹوکے کہ یہ کیا کرتے ہو' کتا مرجائے گا تو ہم اس پر غرائیں گے کہ تم کون ہوتے ہو مدعی سُست گواہ چست والا معاملہ کرنے والے۔ کتے کو تکلیف ہوتی تو وہ بلبلاتا' بھونکتا' ہمیں کاٹتا۔ ہمیں اندازہ نہیں کہ ہمارے اس مزاج' اس رجحان نے گرم خون والی نئی نسل کو تشدد کی طرف دھکیل دیا ہے۔ انہیں کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے انہیں ایکسپلائٹ کرے۔

اور عروس البلاد کراچی میں یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اندر ہی اندر کب سے پکنے والے لاوے کو پھٹ پڑنے کے لئے صرف معمولی سے کسی عمل انگیز کی ضرورت تھی۔ منصور کو سب سے پہلے کرکٹ ٹیموں کے رویئے میں تبدیلی کا احساس ہوا۔ کرکٹ ڈسپلن کا کھیل ہے۔ چھوٹی ٹیموں کے میچوں میں غیرجانبدار امپائروں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹنگ کرنے والی ٹیم کے لڑکے ہی امپائرنگ کرتے ہیں۔ ایسے میں متنازعہ فیصلے ہونا بھی لازم ہے۔ پہلے فیلڈنگ سائیڈ اسے کھیل کا حصہ سمجھ کر قبول کرلیتی تھی۔ اب ان فیصلوں پر ہنگامہ ہوتا تھا۔ لڑائیاں ہوتی تھیں۔ میچ بغیر مکمل ہوئے ختم ہو جاتے تھے۔ ٹیمیں اپنا راستہ لیتی تھیں۔

منصور کی ٹیم میں ابھی بگاڑ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ٹیم کے لڑکے اس کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ مگر بگاڑ کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کچھ لڑکے منصور کی پوزیشن کو چیلنج کرنے لگے تھے۔ وہ اعتراض کرتے تھے کہ مخالف ٹیم کی خراب امپائرنگ کے جواب میں وہ اپنے لڑکوں کو خراب امپائرنگ نہیں کرنے دیتا۔ جس کے نتیجے میں ٹیم میچ ہار جاتی ہے۔ منصور انہیں کھیل کی اسپرٹ اور ہار جیت کے غیراہم ہونے کے بارے میں ہمیشہ سے سمجھاتا آیا تھا لیکن اب اس کی باتیں غیرمؤثر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی میدان میں پیدا ہونے والا بگاڑ درحقیقت اجتماعی سطح پر بگاڑ ظاہر کرتا ہے۔

اسلام کے نام پر علیحدہ وطن حاصل کرنے والے مسلمان اب اس وطن کے لئے دی جانے والی قربانیاں بھلا کر قومیتوں کی بات کر رہے تھے۔ حالانکہ اس بنیاد پر ایک المیے سے دوچار ہو چکے تھے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان ایسا سانحہ نہیں تھا جسے بھلا دیا جاتا۔ مگر اس وقت

بھی یہی کہا گیا تھا کہ اچھا ہوا۔ جان چھوٹ گئی۔ آئے دن سیلاب بھگتنا پڑتے تھے۔ اس المیے پر سوچنے اور اس سے سبق سیکھنے کے بجائے بے حسی اوڑھ لی گئی تھی۔ اور اب جو کچھ ہو رہا تھا وہ بچے کھچے پاکستان کے لئے کڑی آزمائش کے مترادف تھا۔ قومیتوں کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں بن رہی تھیں۔ نئی نسل کے لوگ......... خصوصاً طلبا اس میں پیش پیش تھے۔ شاید ہی کوئی قومیت ایسی بچی ہو' جس کی کوئی طلباء تنظیم نہ ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے کراچی جیسا غریب پرور شہر باہمی نفرت اور حسد کی آگ میں سلگنے لگا۔ جاگتی راتوں کے روشن شہر کی راتیں ویرانی اور خوف سے عبارت ہوگئیں۔ روزگار سے محروم تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایکسپلائٹ کرنے والے میدان میں آگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام نوجوان ایک ایسے سحر میں گرفتار ہو گئے جسے صرف صدائے تکبیر ہی توڑ سکتی تھی لیکن اسلام کے نام پر سیاست کرنے والوں کے دلوں میں بھی سوزِ خلوص نہیں تھا۔

پھر ۳۱ اکتوبر آئی۔ کراچی کی تاریخ کا پہلا خونی......... سیاہ باب لکھا گیا۔ اس کے بعد علی گڑھ کالونی کا سانحہ ہوا۔ بربریت کی انتہا ہو گئی۔ خوف و ہراس' کرفیو' جانوں کا اتلاف اور معاشی تباہی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اہلِ ہوش انگشت بدنداں تھے۔ وہ سوچتے تھے......... یہ پاکستان ہے یا بھارت' جو کچھ پاکستان میں ہو رہا تھا' اس کے سامنے بھارت کے مسلم کش فسادات بے حیثیت تھے۔ وہ سب کچھ شرم سے سر جھکا دینے کے لئے بہت کافی تھا۔ مگر کہتے ہیں کہ خون بہانے والوں کے سر پر خون سوار ہو جاتا ہے۔ وہ جنونی ہو جاتے ہیں اور جنون اور شرم میں تو ازلی بیر ہے۔

وقت ان لوگوں کے لئے بہت کڑا ہو گیا جو مسلم پاکستانی تھے۔ وہ اس بے معنی جنگ میں دونوں طرف غدار تھے۔ وہ لاشوں پر سیاست کرنے والوں کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ اور وہ باقی ملک کو......... اور اربابِ اقتدار کو یہ بتانے پر بھی مجبور تھے کہ استحصال تو ہوا ہے۔ محرومیاں تو حقیقی ہیں۔ انہیں دور کر دو۔ احساسِ محرومی مٹا دو ورنہ ہماری نسلیں تباہ ہو جائیں گی۔ وہ ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے تھے' جہاں مزاجوں میں جمہوریت نہیں تھی۔ طاقت ور سے اختلافِ رائے موت کو دعوت دینا تھا۔ کوئی کسی کی بات معقولیت سے سننے' دلیل سے رد کرنے کا روادار نہیں تھا۔ جہاں سیاسی جماعتوں کے ڈھانچے ہی آمریت اور ملوکیت کی بنیاد پر کھڑے تھے۔ ہر اہم سیاسی جماعت کی قوت کا

سرچشمہ کوئی فردِ واحد تھا اور ہر ایسے فردِ واحد کے ماننے والوں کے نزدیک اس کے ہر حکم' ہر فرمان کی تعمیل ضروری تھی۔ اس سے اختلاف جیسے گناہ تھا۔ لوگ اللہ کے احکامات بھول گئے تھے۔ سب کو بس اپنا اپنا قائد یاد تھا اور اس کے احکامات ازبر تھے۔ ایسے میں وہ مسلم پاکستانی سوائے اس کے کیا کر سکتے تھے کہ اپنے اندر سمٹ کر بیٹھ جائیں۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ یا ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ یا خاموش بیٹھے رہو۔ تیسری صورت میں غداروں کے لئے صرف بدترین موت ہے۔

اور منصور بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ اس نے کرکٹ ٹیم سے ناتا توڑ لیا تھا۔ بس بچپن کے تین دوستوں یعنی شہزاد' نصیر اور منیر سے اس کا تعلق باقی رہ گیا تھا۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر......... یہی اس کا معمول تھا۔ اس نے خود کو ایک خول میں بند کر لیا تھا۔ چاروں دوست کبھی مل بیٹھتے تو دل کی بھڑاس نکل جاتی۔ تاش اب وہ کم ہی کھیلتے تھے۔ زیادہ تر باتیں ہی ہوتی رہتیں۔

اس عرصے میں ہندوستان سے آئے ہوئے ایک مسلمان نے کراچی کی صورتِ حال پر جو تبصرہ کیا تھا' وہ منصور کبھی نہ بھول سکا۔ تبصرہ کیا' وہ ایک تازیانہ تھا۔ اس مہمان نے کہا تھا۔ ''بھائی......... یہاں سے تو ہم ہندوستان میں بھلے۔ وہاں کسی ہندو کے ہاتھوں مارے جائیں تو شہادت کا درجہ پائیں گے۔ یہاں تو مجھے ہر طرف حرام موت نظر آتی ہے اور بھئی لفظ ''شہید'' کو تو تم نے رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔ یہاں تو سزا یافتہ مجرم بھی شہید کہلاتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جس چیز کو منع فرمایا ہے' وہی کچھ کرتے ہوئے مرنے والے بھی شہید۔ معاذ اللہ۔ یہاں تو ہر ظالم سیاسی جماعت کے پاس شہدا کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ معاذ اللہ۔''

☆======☆======☆

دسمبر 92ء

وہ چاروں ٹی وی پر خبرنامہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ وہ دسمبر کی سات تاریخ تھی۔ ساری دنیا کو علم ہو چکا تھا کہ متعصب ہندوؤں نے برصغیر کی تاریخ کے بدترین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ بھارت کے سیکولر ہونے کے دعوے کی قلعی تو بارہا کھل چکی تھی۔ اس بار ان کی جمہوریت اور عدلیہ کے احترام کا دعویٰ بھی جھوٹا ہو گیا تھا۔

بابری مسجد شہید کر دی گئی تھی۔

وزیراعظم نواز شریف نے اگلے روز قومی سطح پر احتجاج کی اپیل کی تھی۔

خبرنامہ ختم ہونے کے ذرا ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ منصور نے جا کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ وہ اس کی پرانی کرکٹ ٹیم کے لڑکے تھے۔ "السلام علیکم۔" منصور نے کہا۔ وہ ان کی آمد پر حیران تھا۔ گزشتہ پانچ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے دروازے پر آئے تھے۔ وہ خود بھی ان سے بے تعلق ہو گیا تھا۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ اس کی بات سننے کو تیار نہیں تھے اور وہ انہیں غلط راستے پر جاتے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی اسے خوشی تھی کہ وہ اس راستے پر زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ ورنہ آپریشن کلین اپ کی زد میں آ گئے ہوتے۔

"منصور بھائی' ہمیں اندر آنے کو نہیں کہیں گے؟" واجد نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ آؤ......... آ جاؤ۔" منصور نے ایک طرف ہٹ کر انہیں راستہ دیا۔

وہ سب کو ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ "تم لوگ بیٹھو' میں چائے بناتا ہوں۔"

"ارے نہیں منصور بھائی۔ ہم تو بس آپ سے باتیں کرنے آئے ہیں۔" حمید بولا۔

"باتیں بھی کر لینا۔" منصور نے کہا۔ "لیکن چائے تو ضروری ہے۔"

منصور چائے لے کر واپس آیا تو وہاں بابری مسجد کے سانحے پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔ لڑکے جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ منصور نے سب کے سامنے چائے کی پیالیاں رکھ دیں۔ وہ سب خاموش ہو گئے۔

"منصور بھائی' آپ ہم لوگوں سے ناراض تو نہیں؟" نعیم نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو' ناراض تو میں ہوں لیکن ایسے جیسے بڑے بھائی چھوٹے بھائیوں سے خفا ہوتے ہیں۔ میرے دل میں تم لوگوں کے لئے کوئی کدورت نہیں۔ دیکھو نا' آدمی خفا انہی سے ہوتا ہے جنہیں اپنا سمجھتا ہے۔"

"منصور بھائی' ہم نے بھی آپ کو ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح سمجھا۔ اختلاف کے باوجود آپ ہمارے لئے محترم رہے۔" فاروق بولا۔

"میں اس کے لئے تم سب کا شکرگزار ہوں۔" منصور کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"منصور بھائی' کل کا کیا پروگرام ہے؟" ممتاز نے پوچھا۔ "بستی سے ایک جلوس

نکلنے والا ہے۔"

"بھئی میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ اس پر ردِ عمل تو شدید ہونا چاہئے لیکن میرا خیال ہے کہ اہم ترین مسئلوں پر جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا چاہئے۔"

"آپ کا مطلب ہے' ایجی ٹیشن غلط ہے؟" حمید نے پوچھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں اس سانحے پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا۔"

"لیکن کیوں؟"

"دیکھو۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم سے کوئی بہت بڑی شکایت ہو تو ایجی ٹیشن ہی مؤثر ترین اظہار سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک اجتماعی رائے ظاہر کرتا ہے۔" منصور نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "لیکن تم سب جانتے ہو کہ ہمارے ہاں ایجی ٹیشن کیسا ہوتا ہے۔ غیر متعلق املاک کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ بسیں' ٹیکسیاں' پرائیویٹ کاریں جلا دی جاتی ہیں۔ پتھراؤ کیا جاتا ہے۔ یعنی نقصان خود کو ہی پہنچاتے ہیں ہم۔ جانی نقصان بھی ہوتا ہے اور یہ سب لاحاصل ہوتا ہے۔ دشمن کا تو کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ وہ تو الٹا خوش ہوتا ہو گا۔ معاملہ جوں کا توں رہ جاتا ہے۔ جذبات سرد ہو جاتے ہیں' بھڑاس نکل جاتی ہے تو ہم چپ ہو بیٹھتے ہیں۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔"

"منصور ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شہزاد بولا۔ "اس معاملے میں بھی یہی کچھ ہو گا۔"

"ہو گا یہ کہ خوب ہنگامہ ہو گا۔ لوگ کچھ مندر جلا دیں گے۔ کچھ ہندوؤں کو ختم کر دیں گے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس حماقت کے نتیجے میں حساب برابر ہو جانے کا تاثر ابھرے گا۔ بھارت اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ پوری دنیا میں واویلا کرے گا۔ یار ذرا سوچو تو' جو کچھ ہوا' وہ اتنی معمولی بات تو نہیں کہ ہم اسے اتنے گھٹیا طریقے سے ختم کر دیں۔"

"تو اب کیا ہو گا منصور بھائی؟" فاروق نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"یہی کچھ ہو گا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو گا۔ اس مسئلے کو سیاسی دکانیں چمکانے کے لئے استعمال کیا جائے گا اور مختلف سیاسی جماعتیں اپنی قوت کا اندازہ لگانے کے لئے عوام سے ہڑتال کی اپیل کریں گی۔ توڑپھوڑ' جلاؤ گھیراؤ کا سلسلہ چلے گا اور پھر

چھٹی۔"

"میں تو کہتا ہوں' ہمیں بھارت پر حملہ کر دینا چاہئے۔" اکبر نے بپھر کر کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔" نصیر بولا۔ "یہ ایٹمی دور ہے۔ جنگیں تباہ کن ہوتی ہیں۔ تباہی بھی فوجوں کی نہیں ہوتی۔ شہر کے شہر اجڑ جاتے ہیں۔ پھر بین الاقوامی دباؤ الگ۔ اب وہ زمانہ نہیں کہ لشکر کشی کی گئی۔ فوجوں میں لڑائی ہوئی۔ ہماری فوج فتح یاب ہوئی اور ہم نے لال قلعے پر جھنڈا لہرا دیا۔"

"اور اگر جنگ ہو بھی جائے تو اس سے کیا حاصل ہو گا؟" منصور نے کہا۔ "نہیں بھائی' یہ وہ دور ہے جس میں حکومتیں مجبور ہیں۔ کسی کے خلاف جنگ چھیڑ دینا آسان کام نہیں۔ یہ ڈپلومیسی کا دور ہے اور میرے خیال میں بابری مسجد کا سانحہ صرف اجتماعی نہیں' ہم سب کا انفرادی مسئلہ بھی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے' وہ ہر مسلمان کی دینی و ملی حمیت کے لئے ایک چیلنج ہے۔ ایسی صورتِ حال میں سینوں میں چنگاریاں تو پھوٹتی ہیں......... آگ تو بھڑکتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم بچوں کی طرح بھڑک اٹھتے ہیں۔ ہم اندر کی آگ کے نکاس کے گھٹیا طریقے ڈھونڈتے ہیں۔ ہمیں خود کو تپانا' جھلسانا' جلانا نہیں آتا۔ اس وقت میرے سینے میں جو آگ بھڑک رہی ہے' میں دشمنوں کی عورتوں کو گالیاں اور کوسنے دے کر' ایجی ٹیشن کے نام پر املاک کو آگ لگا کر' دشمنوں کے پتلے جلا کر' نفرت کا اظہار کر کے اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا......... اور کروں گا بھی نہیں۔ میں تو اس آگ کو خدا کی امانت کے طور پر سنبھال کر رکھوں گا۔ میں اپنے سینے میں الاؤ دہکاؤں گا اور وقت کا انتظار کروں گا۔ اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ میں اس سلسلے میں بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"لیکن منصور بھائی! فرد کر ہی کیا سکتا ہے؟"

"افراد کچھ نہیں کرتے اور تعداد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی' لیکن سینے میں الاؤ دہکایا جائے اور جذبہ صادق ہو تو ایک فرد کائنات کو بھسم کر سکتا ہے۔" منصور کے لہجے میں یقین تھا۔ "دیکھ لینا اس معاملے میں کوئی فرد ہی کچھ کرے گا۔"

"بہت بہت شکریہ منصور بھائی۔" حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم بھی انشاء اللہ اپنی آگ ضائع کرنے کے بجائے سینے میں الاؤ دہکائیں گے۔"

"لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کچھ کر بھی سکتے ہیں یا نہیں۔" فاروق بولا۔

"ایسے معاملات میں قدرت رہنمائی کرتی ہے۔" منصور نے جواب دیا۔ "اور میری ایک بات یاد رکھنا۔ انشاء اللہ! بھارت اپنی موجودہ جغرافیائی صورت میں اکیسویں صدی کا منہ نہیں دیکھ سکے گا۔" وہ انہیں رخصت کرنے دروازے تک گیا۔

☆======☆======☆

آٹھ دسمبر کو مکمل ہڑتال ہوئی۔ منصور پورا دن گھر میں ہی رہا۔ شام سات بجے میرا کا فون آیا۔ "تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟" میرا نے پوچھا۔

"میں سمجھ گیا' تم مجھے بلانا چاہتی ہو۔ ہے نا؟"

"ہاں' یہی بات ہے۔"

"تفصیل سے بات کرو۔"

"کل صبح دس بجے مجھ سے کہیں ملو۔"

"کہاں؟"

"کوئی ایسی جگہ ہو' جہاں سکون سے بات ہو سکتی ہو۔"

منصور سوچ میں پڑ گیا۔ "تم کہاں سے چلو گی؟" ایک لمحے بعد اس نے پوچھا۔

"صدر سے۔"

"تم ایسا کرنا۔ ایمپریس مارکیٹ سے U-4 میں بیٹھنا اور طارق روڈ' کیفے لبرٹی کے اسٹاپ پر اتر جانا۔ میں دس بجے تمہیں وہاں کھڑا ملوں گا۔"

"سنو.......... میں برقعے میں ہوں گی۔"

منصور کو یہ سن کر حیرت ہوئی۔ "کیا مطلب؟"

"بس میں برقع پہنے ہوں گی۔ باقی باتیں ملنے پر۔"

"تم نے فون کہاں سے کیا ہے؟"

"ایک سہیلی کے گھر سے۔ اچھا منصور' انشاء اللہ کل ملیں گے۔" یہ کہہ کر میرا نے ریسیور رکھ دیا۔

منصور کو میرا کے منہ سے انشاء اللہ سن کر شاک لگا تھا۔ شاید ان دنوں وہ مسلمانوں کی صحبت میں زیادہ ہی رہی ہے۔ اس نے سوچا۔

پچھلے سات برسوں میں ان کے درمیان چار پانچ بار فون پر گفتگو ہوئی تھی لیکن وہ

ملے کبھی نہیں تھے۔ منصور ان کے گھر کبھی نہیں گیا تھا۔ بچھڑتے وقت میرا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ صرف شدید ضرورت ہی میں اسے بلائے گی' اور پچھلے سات برس میں اس نے ایک بار بھی نہیں بلایا تھا۔ یعنی اس نے اپنا وعدہ پوری سچائی سے نبھایا تھا۔

یہ خیال آتے ہی منصور پریشان ہو گیا۔ صورتِ حال ہی ایسی تھی۔ بابری مسجد کے سانحے کا ردِ عمل شدید ہوا تھا۔ کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا۔ منصور کا جی چاہا کہ خود جا کر دیکھے۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ میرا نے فون پر نارمل گفتگو کی تھی۔ اس کے لہجے میں پریشانی یا بدحواسی ہرگز نہیں تھی۔

اب وہ ایک ایک پل گن گن کر کاٹ رہا تھا۔ سات برس......... اف......... پورے سات برس! اب اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے اتنے طویل عرصے خود کو میرا سے ملنے سے باز کیسے رکھا' کیسے ضبط کرلیا۔ پھر اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اس میں اس کا کوئی کمال نہیں تھا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ غمِ جاناں کے بارے میں سوچنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔" مگر اب وہ میرا سے ملنے کو بے تاب تھا۔

رات وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا۔ اس نے فجر کی نماز پڑھی پھر ناشتہ کیا۔ نو بجے اس نے اپنے آفس فون کر کے بتا دیا کہ وہ دفتر نہیں آسکے گا۔ پھر وہ تیار ہو کے نکلا۔ اس نے طارق روڈ کے لئے رکشا کرلیا۔

دس بجنے میں پانچ منٹ پر وہ کیفے لبرٹی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ہر شخص اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ یہاں کسی لڑکی کے انتظار میں کھڑا ہے۔ مگر دو تین منٹ بعد ہی میرا سے ملنے کی خوشی ہر احساس پر حاوی آگئی۔ دس بج کر دس منٹ پر ایک U-4 آکر رکی۔ اس میں سے ایک دراز قد برقعہ پوش لڑکی اتری۔ منصور نے لڑکی کو دیکھا......... لیکن نہیں دیکھا۔ میرا کے بتانے کے باوجود اس نے میرا کا برقعے میں تصور نہیں کیا تھا۔ وہ تو لڑکی کی آنکھوں میں مخصوص جانی پہچانی چمک ابھرتے دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ وہ میرا تھی۔

یہ نہیں کہ میرا بہت بدل گئی تھی۔ وہ ویسی ہی تھی۔ بس اس کے چہرے پر ایک

تھکن سی تھی۔ جیسے وہ بہت طویل سفر کر کے تھک گئی ہو۔ البتہ برقعے نے اس کی پوری شخصیت کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

ان دونوں کی نگاہیں ملیں۔ دونوں ایک ایک قدم آگے بڑھے۔ ایک قدم کا فاصلہ اور تھا۔ مگر درمیان میں سات برس کی مسافت کی گرد تھی۔ دونوں ہی کی آنکھیں جلنے لگیں۔ دونوں اپنی جگہ ٹھہر گئے۔ جیسے درمیان میں سات برس کا فاصلہ ہو۔ وقت کا بہتا دھارا جیسے رک گیا۔

چند لمحے وہ یونہی کھڑے رہے۔ پھر میرا مسکرائی۔ منصور بھی مسکرایا۔ وہ چند لمحے سات برسوں پر حاوی تھے۔ وہ چند لمحے سات برس کی جدائی اور اذیتوں کی تلافی کر گئے۔ وہ بیک وقت ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ "السلام علیکم۔" میرا نے کہا۔

منصور نے بے ساختہ اس کے سلام کا جواب دیا......... اور پھر اچانک حیران رہ گیا۔

میرا نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ "کیسے ہو پریتم؟"

"اب کیا پوچھتی ہو۔ اب تو جیسا بھی ہوں' تمہارے سامنے ہوں' دیکھ لو۔" منصور نے کہا پھر شریر لہجے میں بولا۔ "مگر یہاں نہ دیکھنا۔ مجمع لگ جائے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

انہوں نے سڑک پار کی......... پھر دوسری سڑک پار کی۔ منصور اسے ایرانیان کافی ہاؤس کے فیملی روم میں لے گیا۔ ان کے کیبن میں بیٹھتے ہی بیرا نازل ہو گیا۔ "کیا لاؤں صاحب؟"

منصور کا جی چاہا کہ کہے......... چودہ برس کی تنہائی۔ اپنی اس سوچ پر اسے خود ہنسی آگئی۔ "چائے لے آؤ۔" اس نے کہا۔

بیرے کے جانے کے بعد منصور نے کہا۔ "کیسی ہو؟"

"میں یہ نہیں کہوں گی کہ اب تو تمہارے سامنے ہوں۔ جیسی بھی ہوں' خود دیکھ لو۔" میرا نے کہا۔ "اس لئے کہ صرف مجھے دیکھ کر تم نہیں سمجھ سکو گے۔ بہرحال میں بہت اچھی ہوں......... اور بہت خوش۔ تمہاری جدائی کی آگ نے مجھے کندن بنا دیا ہے۔"

"کچھ کمزور اور تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔" منصور کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آ رہی تھی۔

"ہاں پریتم' سفر بہت کٹھن تھا۔ تم سمجھ نہیں سکتے۔ بہت کٹھن سفر تھا میرا۔ اور تم سناؤ۔ ٹھیک تو ہو۔"

"بالکل فرسٹ کلاس۔ میں بھی بہت تھک گیا تھا۔ البتہ اب خود کو تازہ دم محسوس کر رہا ہوں۔"

"تھکن کیسی تھی؟"

"تمہاری جدائی نے میرا کچھ نہیں بگاڑا لیکن وقت میں نے بھی بہت سخت گزارا ہے۔"

"میں جانتی ہوں یہ بات اور مجھے یہ سن کر خوشی بھی ہوئی۔" میرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خود مجھے تمہاری جدائی نے کچھ کا کچھ بنا دیا۔"

منصور کی سمجھ میں اچانک ہی ایک بات آگئی۔ "اور یہ کیا چکر ہے۔ کل تم نے انشاء اللہ کہا تھا اور آج تم نے مجھے سلام کیا ہے۔"

"اتنی آسان سی بات کا مطلب نہیں سمجھتے۔ میں مسلمان ہو چکی ہوں۔"

منصور سناٹے میں آگیا۔ یہ اطلاع اس کے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔

"لیکن.......... لیکن مجھے تو کسی نے بھی نہیں بتایا۔"

"میری ایک سہیلی کے سوا کسی کو یہ بات معلوم نہیں۔" میرا نے جواب دیا۔ "وہی سہیلی' جس کے گھر سے تمہیں فون کیا تھا۔ اس نے میری بڑی مدد کی۔ اسی نے مجھے نماز پڑھنا سکھایا۔ صرف وہی میری رازدار ہے۔"

"یہ.......... یہ کب کی بات ہے؟" منصور نے پوچھا۔ وہ اب تک شاک سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"صدر شفٹ ہونے کے فوراً بعد میں نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا تھا۔ دل سے تو میں بہت پہلے ہی ایمان لا چکی تھی۔ گھر والوں کو میں نے نہیں بتایا۔"

"مگر مجھ سے تو تمہاری کئی بار فون پر بات ہوئی۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"تم کو بتاتی تو تم یہی کہتے کہ میں تمہاری محبت کی وجہ سے مسلمان ہوئی ہوں۔ یہ بات میں سننا نہیں چاہتی تھی۔"

"لیکن تمہیں یہ کام علی الاعلان کرنا چاہئے تھا۔" منصور نے خشک لہجے میں کہا۔

"تم سے شادی کا امکان ہوتا تو میں یہی کرتی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لانے والے' خدا کے حکم سے یہ بات پوشیدہ رکھتے تھے۔ اس لئے کہ ان کی جانوں کو خطرہ لاحق تھا۔ یہی مسئلہ میرے ساتھ بھی تھا۔ میں مسلمان ہونے کا اعلان کرتی تو میرے سامنے دو صورتیں تھیں۔ یا میں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتی یا بے ٹھکانہ ہو جاتی۔ پہلی صورت میں یہ طے تھا کہ میرے پپا مجھے زہر دے دیتے اور دوسری صورت میں مجھ اکیلی لڑکی کا جینا دوبھر ہو جاتا۔ اسلام کی رُو سے میرے لئے کسی سے شادی کرنا ضروری ہو جاتا' جو میں نہیں کر سکتی تھی۔ پھر ایک مصلحت بھی تھی۔ میں اعلان کرتی تو تمام ہندو میری فیملی کا بائیکاٹ کر دیتے۔ میری بہنوں کی زندگی تباہ ہو جاتی۔ جانتے ہو' اُوشا اور تارا کا بیاہ ہو چکا ہے۔ اب صرف شاردا بچی ہے۔ وہ بھی انشاء اللہ جلد اپنے گھر کی ہو جائے گی۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ بیرا چائے لے آیا تھا۔ وہ چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔ چائے کی پیالی منصور کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اور تم نے جو میری جواب طلبی کی ہے تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ معاملہ میرے اور اللہ کے درمیان ہے اور اللہ دلوں کے حال جانتا ہے۔ یہ بھی سن لو کہ میں تمہاری محبت میں.......... تم سے شادی کرنے کے لئے مسلمان نہیں ہوئی۔ اللہ کی ہدایت میرے کام آئی ہے۔ پہلے میرا دل ایمان سے روشن ہوا ہے۔"

منصور دم بخود بیٹھا تھا۔ میرا تو واقعی کہیں کی کہیں پہنچ چکی تھی۔ اس نے نہایت مدلل جواب دے کر اسے لاجواب اور شرمندہ کر دیا تھا۔ "میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کرو میرا۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔

"جن مولوی صاحب کے سامنے میں نے اسلام قبول کیا تھا' انہوں نے میرا نام حمیرا رکھا تھا۔ تم بتاؤ' تم مجھے کس نام سے پکارو گے؟"

"میں تو تمہیں رابعہ کہوں گا۔" منصور نے بلاجھجک کہا۔

"بس تو اب میں رابعہ ہوں۔"

"ایک بات بتاؤ۔ تم نے گھر والوں سے چھپایا تھا کہ تم مسلمان ہو گئی ہو' تب تو تم نے دکھاوے کو پوجا پاٹ بھی کی ہو گی؟"

"بڑے بدگمان ہو۔" میرا نے اسے گھور کر دیکھا۔ "تمہیں نہیں معلوم' پوجا کرنا تو

میں نے صدر شفٹ ہونے سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ پھر میں نے سروس کرلی تو ویسے ہی بری الذمہ ہو گئی۔ ماں کہتی تھی' میرا تھکی ہاری آتی ہے۔ یہ کام اب شاردا کرے گی۔"

"رابعہ......... اب میں خود تمہیں قرآن پاک پڑھاؤں گا۔"

"سات سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے' منصور۔ میں قرآن پاک ختم کر چکی ہوں اور ہر روز تلاوت کرتی ہوں۔"

منصور کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔ ان سات برسوں میں اس نازک سی لڑکی نے کیا کچھ کیا تھا......... اور کس قدر تنہا رہی تھی وہ۔ کتنی اکیلی.........

"مجھ سے یہ نہیں پوچھو گے کہ میں نے آج کس ضروری کام کے تحت تمہیں ملنے کے لئے بلایا ہے۔"

"تم نے اتنے دھماکے کئے کہ مجھے یہ پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ حالانکہ تجسّس بہت تھا مجھے۔ اب بتا ہی دو۔"

"وہ آخری ملاقات یاد ہے تمہیں؟"

منصور سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "اوہ......... وہ رات........."

"بس۔ اتنا حوالہ ہی کافی ہے۔" رابعہ کی نظریں جھک گئیں اور چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ "وہ سب کچھ مجھے شرمندگی کے ساتھ ہمیشہ یاد رہا۔ میں ہمیشہ اس خطا پر خدا سے توبہ کرتی رہی۔ بڑی سچی توبہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ نے قبول کرلی ہوگی لیکن مجھے ایک خلش سی رہی۔ میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ تم سے شادی کروں گی تو تلافی بھی ہو جائے گی۔ آج میں تم سے یہی کہنے آئی ہوں کہ مجھ سے شادی کرلو۔ پہلے اس کا جواب دے دو پھر میں ایک اور بات کروں گی۔"

"تم سے شادی کرنا تو میرے لئے باعثِ افتخار ہوگا۔" منصور نے کہا۔ "لیکن شاردا کا کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہماری شادی کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا لیکن پہلے تم ہاں تو کرو۔"

"ہاں تو میں کر چکا ہوں لیکن تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" منصور کے لہجے میں الجھن تھی۔ "ہم شادی چھپ کر کیوں کریں گے؟"

"یہ ضروری ہے پریتم!" وہ بولی' پھر اس کی نظر چائے کی پیالیوں پر پڑی' جو جوں کی توں رکھی تھیں۔ "بیرے کو بلا کر اور چائے منگواؤ۔"

بیرا برتن سمیٹ کرلے گیا اور دوسری چائے لے آیا۔ رابعہ نے چائے بنائی۔ چائے کا پہلا گھونٹ لینے کے بعد اس نے وضاحت کی۔ "اب میں اپنے گھر واپس نہیں جاؤں گی۔"

"وہ تو ظاہر ہے لیکن اس صورتِ حال میں تمہاری گمشدگی مسئلہ بن جائے گی۔ تمہارے پپا' تمہاری برادری اس سلسلے میں اوپر تک اپروچ کر سکتی ہے' جو کہ عام حالات میں ممکن نہ ہوتا۔ ہاں ہماری شادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم قانونی طور پر خود مختار ہو لیکن شادی کو خفیہ رکھنا......... اس کی کیا ضرورت ہے آخر؟"

"ضرورت ہے۔ پتا ہے' فوج کی موجودگی میں کل راتوں رات بابری مسجد کی جگہ مندر تعمیر کر دیا گیا ہے۔ کیا ہم یہ گوارا کر سکتے ہیں؟ جب کہ ہماری حکومت سفارتی سطح پر کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی۔"

"مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ تم یہ بتاؤ' کچھ کرنا چاہتے ہو؟"

"میں تو اس سلسلے میں جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"بس تو میری طرف سے بے فکر رہو۔ جو سبب تم نے میری گمشدگی سے متعلق پریشانی کا بیان کیا ہے' اس کا ایک اور رخ بھی ہے۔ اس صورتِ حال میں میرے گھر والے میری گمشدگی کے بعد یہی سوچ سکتے ہیں کہ مجھے کسی مشتعل مسلمان نے اغوا کر لیا ہے۔ وہ مجھے مردہ بھی فرض کر سکتے ہیں۔ اب میری بات غور سے سنو۔"

وہ کہتی رہی۔ منصور سنتا رہا۔ سینے کا الاؤ اور دہک اٹھا تھا۔

☆======☆======☆

وہ تینوں دیکھ رہے تھے کہ منصور بدل کر رہ گیا ہے۔ زیادہ تر وہ خاموش اور گم صم رہتا۔ کبھی اچانک چہکنے لگتا' اس وقت وہ پرانا منصور نظر آتا لیکن وہ بس چند لمحوں کی بات ہوتی۔ ورنہ وہ کسی گہری سوچ میں گم رہتا۔ بات بھی کم ہی کرتا۔ کچھ پوچھا جاتا تو مختصر جواب دیتا۔ وہ تینوں اس سے کئی بار پوچھ چکے تھے کہ بات کیا ہے۔ وہ ہر بار کہتا' کوئی بات

نہیں۔ بس بولنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ بابری مسجد کے موضوع پر کوئی بات ہوتی تب بھی وہ گم صم بیٹھا رہتا۔

ویسے اس کی کہی ہوئی بیشتر باتیں درست ثابت ہوئی تھیں۔ یوں یومِ احتجاج پر کئی مندر جلا کر لوگوں کی تسلی ہوگئی تھی' قائد حزبِ اختلاف نے مسجد کی شہادت کا ذمے دار موجودہ حکومت کی خارجہ پالیسی کو ٹھہرایا تھا یعنی اس دعوے کی تجدید کی تھی کہ تمام مسائل کا حل اور جمہوریت کی بقا اسی میں ہے کہ انہیں اقتدار مل جائے۔ پھر بھارتی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ بابری مسجد کو دوبارہ تعمیر کرائے گی۔ اس پر کچھ لوگوں نے سکون کا سانس لیا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ ہندوؤں نے یہ وعدہ کر کے اپنی فطری مکاری سے کام لیا ہے۔

منصور نے مونچھیں چھوڑ دی تھیں۔ بچپن کے دوستوں کے لئے یہ بات حیرت انگیز تھی۔ وہ جانتے تھے کہ منصور کا شروع ہی سے یہ خیال تھا کہ اس پر مونچھیں اچھی نہیں لگیں گی۔ کئی بار بستی کے کچھ لڑکوں نے اسے ٹوکا تھا۔ "یار منصور' مونچھیں ہی رکھ لو۔"

"کیوں رکھ لوں؟" منصور کا ہمیشہ یہی سوال ہوتا تھا۔ "کیا مونچھیں رکھنا فرض ہے؟"

"فرض تو نہیں البتہ مونچھ مردانگی کی علامت ہوتی ہے۔ مونچھوں کے بارے میں یہ جملہ ہمیشہ کہا جاتا ہے۔"

"میرے خیال میں مردانگی کسی اظہار' کسی علامت' کسی اعلان کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ تو بوقتِ ضرورت بے ساختہ سامنے آتی اور خود کو منوا لیتی ہے۔" منصور کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا تھا لیکن اب وہ مونچھیں پال رہا تھا۔

"یار منصور' یہ تمہیں مونچھوں کی کیا سوجھ گئی؟" ایک روز نصیر نے پوچھا۔

"بس جی چاہا تھا سو مونچھیں چھوڑ دیں۔"

"تمہارا تو خیال تھا کہ تمہارے چہرے پر مونچھیں اچھی نہیں لگیں گی۔" منیر نے اسے یاد دلایا۔

"خیال تو اب بھی یہی ہے لیکن اب ۳۳ سال کی عمر میں یہ بچوں جیسا چہرہ اچھا نہیں لگتا۔"

درحقیقت رابعہ سے ملاقات کے بعد منصور پریشان بھی تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ خوفزدہ ہوا تھا۔ ڈر اسے اس لئے تھا کہ اس معاملے میں اس کا پولیس سے سابقہ پڑ سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میرا کی گمشدگی کے سلسلے میں جب رپورٹ درج کرائی جائے گی تو پولیس یہ سوال ضرور کرے گی کہ گردھاری لال کو کسی پر شک تو نہیں۔ ایسے میں یہ ناممکن نہیں تھا کہ گردھاری لال اس کا نام لے دے۔ کلاوتی کو یقیناً اس کا خیال آئے گا۔ ایسا ہوا تو پولیس پوچھ گچھ کے لئے آئے گی اور پولیس کا کسی کے دروازے پر آنا ہی صاحبِ خانہ کی بے عزتی کے لئے بہت ہے۔ منصور کو اباجان کی وجہ سے عزت کا خیال ہمیشہ رہتا تھا۔

ویسے رابعہ نے اسے ہر طرح سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس روز وہ گھر واپس نہ جانے کا فیصلہ کر کے نکلی تھی۔ منصور چاہتا تھا کہ اسے اپنی نصرت آپا کے گھر لے جائے۔ نصرت اس کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ وہ سب سے زیادہ نصرت سے ہی قریب تھا۔ بہنوئیوں میں بھی نصرت کا شوہر ذیشان اسے سب سے اچھا لگتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ رابعہ کو نصرت کے گھر لے جائے گا۔ وہیں تینوں بہنیں اپنے شوہروں اور بچوں سمیت آ جائیں گی۔ شادی کی مختصر سی' لیکن اچھی خاصی تقریب ہو جائے گی لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ شادی چھپ کر نہ کی جائے۔ مگر رابعہ نے اسے قائل کر دیا تھا۔

رابعہ نے ہر طرح سے اس کے تحفظ کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ منصور سے ہر بات طے کرنے کے بعد وہ اپنی سہیلی ناہید کے گھر چلی گئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے اسے ناہید کا فون نمبر بھی دے دیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ رابعہ کی گمشدگی کا مسئلہ سرد ہوتے ہی منصور اسے فون کرے گا۔ پھر نصرت آ کر اسے اپنے ساتھ لے جائے گی اور شادی کی تقریب میں صرف گھر کے لوگ شریک ہوں گے۔ رابعہ نے بتایا تھا کہ ناہید کے متعلق اس کے گھر میں کسی کو بھی معلوم نہیں۔ یہ ناہید وہی سہیلی تھی' جس سے رابعہ اسلام کے متعلق سیکھتی' جانتی رہی تھی۔ اسی کے گھر پر رابعہ نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا تھا۔

میرا کی گمشدگی کی رپورٹ گردھاری لال نے تیسرے دن درج کرائی تھی۔ ایک دن وہ اسے اپنے طور پر تلاش کرتا رہا تھا۔ میرا کے دفتر سے اسے معلوم ہوا کہ میرا تو گذشتہ روز بھی دفتر نہیں آئی تھی۔ یہ خبر چوتھے روز شائع ہوئی۔

ابتدائی چند روز منصور کے لئے پریشان کن تھے۔ ہر دستک پر وہ سوچتا کہ پولیس آئی ہے حالانکہ ڈر کی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ سنٹرل ڈویژن کا ایس پی ذوالفقار اس کے بہنوئی ذیشان کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ منصور کی بھی اس سے خاصی یاد اللہ ہو گئی تھی۔

تین ہفتے گزر گئے۔ نیا سال آ گیا۔ اب منصور مطمئن ہو گیا۔ اس کی مونچھیں بھی باقاعدہ ہو چکی تھیں۔ ایک روز اس نے شہزاد سے کہا۔ "یار......... میں یہ ہوٹل کا کھانا کھاتے کھاتے بیزار ہو گیا ہوں۔"

شہزاد کے کچھ کہنے سے پہلے منیر بول اٹھا۔ "بہت دیر کی بیزار ہوتے ہوتے۔"

"میں تو کہتا ہوں' اب شادی کر لو۔" شہزاد بولا۔

"ہاں یار' اب تو میرے بچے بھی پوچھنے لگے ہیں کہ کیا سچ مچ انکل منصور آپ کے ساتھ پڑھے ہیں۔" نصیر نے کہا۔

"شادی تو خیر میں ابھی نہیں کر سکتا۔ دو تین سال بعد کروں گا۔" منصور نے کہا۔

"لیکن میں نے نصرت آپا کے ہاں شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"یعنی ہماری محفل اجڑنے والی ہے۔" منیر اداس ہو گیا۔

"تو یار' کون سا ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ آتا رہوں گا اور پھر نصرت آپا کا گھر بھی اسی شہر میں ہے۔ تم بھی جب چاہو ملنے کے لئے آ سکتے ہو۔"

"اس شہر کی مصروفیت کا حال تو تم جانتے ہو۔" شہزاد بولا۔ "اتنے قریب رہنے کے باوجود بعض اوقات ہم کئی کئی دن نہیں مل پاتے۔"

"یہی زندگی ہے دوستو' شادی ہو جائے' بچے ہو جائیں تو وقت کم ہی نکلتا ہے۔" منصور نے کہا۔ "اسی لئے تو میں ابھی دو تین سال آزاد رہنا چاہتا ہوں۔"

اس روز وہ تینوں یوں رخصت ہوئے جیسے ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہے ہوں۔ اگلے روز منصور نے اپنے کپڑے اور ذاتی استعمال کی چیزیں ایک سوٹ کیس میں رکھیں اور نصرت کے گھر چلا گیا۔ نصرت اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی کیونکہ وہ کم ہی آتا تھا۔ اس نے نصرت کو ایک خاص بات کے سوا سب کچھ بتا دیا۔ نصرت کھل اٹھی۔ بہنوں کو ہمیشہ چھوٹے بھائیوں کی شادی کی آرزو ہوتی ہے لیکن منصور ہمیشہ ٹالتا رہا تھا اور آج وہ خود.........

"سچ کہہ رہے ہو منصور۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" وہ بولی۔

"تمہیں اس بات کا ملال تو نہیں کہ میں ایک نومسلم لڑکی کو تمہاری بھابی بنا رہا ہوں؟" منصور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" نصرت نے بلاتاخیر جواب دیا۔ "تمہاری پسند کوئی ایسی ویسی نہیں ہو سکتی۔ ہم چاروں بہنوں کو اس معاملے میں تم پر کتنا مان ہے' اس کا تصور بھی تم نہیں کر سکتے اور پھر وہ لڑکی' جس کے لئے تم اتنے برسوں سے بیٹھے ہو۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ.........."

"تم ہر بار شادی سے انکار کرتے رہے اور ہم بہنوں نے کبھی اصرار نہیں کیا۔ صرف اس لئے کہ ہمیں معلوم تھا کہ تم اس ہندو لڑکی کو چاہتے ہو۔ صفیہ باجی نے ہمیں بتا دیا تھا۔ یہ بات تو پوری بستی کو معلوم تھی لیکن تم چھوٹے ہو کر بھی اتنے بڑے ہو کہ یہ بات تم سے کہی نہیں جا سکتی تھی۔ ہم کیا' کوئی بھی نہیں کہہ سکا۔ ورنہ بستی میں زبان دراز عورتیں بھی تو ہیں۔"

منصور شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ وہ اپنے تئیں یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی محبت کا راز اس کے دوستوں کے سوا کسی کو بھی نہیں معلوم۔ "تو آپا' اب میں رابعہ کو فون کر دیتا ہوں۔ تم جا کر اسے لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اسے فون کر دو کہ میں اکیلی اسے لینے نہیں جاؤں گی۔ ہم چاروں بہنیں جائیں گی اور بڑی شان سے لے کر آئیں گی۔ تمہاری شادی کا ارمان صرف مجھے نہیں سبھی کو ہے اور اب خدا خدا کر کے ہمیں یہ موقع ملا ہے.........."

"آپا' جو جی چاہے کرو۔ میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن اس شادی کا علم گھر کے لوگوں کے سوا کسی کو نہیں ہونا چاہئے۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ ہے.........."

"تو وجہ بھی بتا دو۔"

"بس آپا' اس پر مجبور نہ کرنا۔ وجہ میں نہیں بتا سکتا۔"

"ڈر رہے ہو تو غلط بات ہے۔ میں ذیشان سے کہوں گی' وہ ذوالفقار بھائی سے بات کر لیں گے۔"

"نہیں آپا' بات ڈر کی نہیں۔ میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا ہوں کہ ڈروں۔ بات کچھ اور ہے۔"

"ٹھیک ہے منصور.......... تم سے تو ہم لڑ بھی نہیں سکتے۔" نصرت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اب تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ میں تمام بہنوں کو بتانے جا رہی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد منصور نے رابعہ کو فون پر خوش خبری سنا دی۔

اگلے روز منصور اور رابعہ کا نکاح ہو گیا۔ سہاگ رات ان کے لئے شکر کی رات تھی۔ دونوں محسوس کر رہے تھے کہ ان کی سات سال پرانی خطا دھل گئی ہے۔

اس کے بعد منصور پوری طمانیت کے ساتھ ان کاموں میں مصروف ہو گیا جو بہت ضروری تھے.......... جن پر اس کے مستقبل کا دارومدار تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وطن عزیز میں جو چیزیں جعلی بنتی ہیں.......... ہر چیز دو نمبر کی بھی جو موجود ہوتی ہے تو اس کی بھی کوئی افادیت ہے۔ اسے اپنا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانا تھا۔ اس میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پھر وہ ایس پی ذوالفقار سے ملا۔ ذوالفقار کو رازداری پر قائل کرنا خاصا دشوار کام تھا۔ بہرحال وہ اس مرحلے سے بھی گزر گیا۔ ذوالفقار کے ذریعے وہ ایک اور افسر سے ملا۔ معاملات طے ہو گئے۔ اب اسے صرف مناسب وقت کا انتظار تھا۔

وہ نصرت کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔ ایک روز نصرت نے کہا۔ "منصور.......... دلہن کو لے کر کہیں گھوم پھر آؤ۔"

"جاؤں گا آپا' موسم بہار میں کشمیر دیکھنے کی بڑی آرزو ہے۔ اس موسم میں برفباری بھی ہوتی ہے اور سرسوں بھی کھلتی ہے۔ سنا ہے' بڑا خوبصورت سماں ہوتا ہے' اپریل میں شاید جاؤں۔ ابھی تو مصروفیت بہت ہے۔"

☆======☆======☆

بابری مسجد کے معاملے میں حسب توقع اور حسب روایت بھارتی حکومت نے مکاری سے کام لیا۔ مسجد کی تعمیر کا وعدہ ٹلتا رہا اور رام مندر کی باقاعدہ تعمیر شروع ہو گئی۔ تعمیراتی کمپنی کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کی تاریخ کا خوبصورت ترین مندر ثابت ہو گا۔ کام فوج کے تحفظ میں ہو رہا تھا۔ اس علاقے کو ممنوعہ علاقہ قرار دے دیا گیا تھا۔

حکومت پاکستان نے سفارتی سطح پر بارہا احتجاج کیا۔ بھارتی حکومت کبھی اسے اندرونی

معاملہ قرار دے کر مسترد کر دیتی اور جب عالمی اور خاص طور پر اسلامی دباؤ بڑھتا تو وعدہ کر لیتی کہ وہاں بابری مسجد دوبارہ تعمیر ہو گی۔

بالآخر مارچ میں پاکستانی قوم کا ضبط جواب دے گیا۔ بپھرے ہوئے مسلمان سڑکوں پر نکل آئے۔ ہندوؤں کے گھروں پر حملے بھی کئے گئے۔ کشیدگی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سرحدوں پر بھی صورتِ حال بہت خراب تھی۔ عام لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس صورتِ حال کے باوجود دونوں ملکوں کے درمیان بہت سے معاملات بدستور حسبِ سابق چل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک معاملہ غذائی اجناس کی سمگلنگ کا بھی تھا۔ پاکستان سے گندم' چاول اور چینی غیرقانونی طور پر سرحد پار جاتی تھی.......... اور جا رہی تھی۔ ان معاملات میں جو بااثر لوگ ملوث تھے' وہ مذہب کی تفریق سے بے نیاز تھے۔ ان کے درمیان صرف مفادات اور ضرورت کا رشتہ تھا اور ایسے رشتے بڑے مستحکم ہوتے ہیں۔ تعلقات کی اس زنجیر کی کڑیاں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

مارچ کے اواخر میں کراچی انتظامیہ کے ایک اعلیٰ افسر نے میرپور خاص انتظامیہ کے ایک اہم افسر کو فون کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے صرف کولیگ ہی نہیں' بلکہ پرانے دوست بھی تھے۔ ان کی رفاقت اسکول کے زمانے سے تھی۔ کراچی کے افسر کو میرپور خاص کے افسر سے کام درپیش تھا۔ وہ کوئی غیرمعمولی بات نہیں تھی۔ شہروں کے بادشاہ ایک دوسرے کے کام آتے رہتے ہیں۔

علیک سلیک اور ایک دوسرے کی مزاج پُرسی کے بعد کراچی کے افسر نے کہا۔ "یار ایک کام آ پڑا ہے تجھ سے۔ یہاں میرا ایک خاص جاننے والا ہے۔ ہندو ہے رمیش نام کا۔ وہ خطرے میں ہے۔ یہاں رہے گا تو مارا جائے گا۔ تفصیل میں فون پر نہیں بتا سکتا۔ اسے اور اس کی بیوی کو سرحد پار کرانی ہے۔"

میرپور خاص کے افسر نے چند لمحے سوچا اور بولا۔ "یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا یار' تیرا حکم ہے تو بس سمجھ لے کام ہو گیا۔"

"وہ بڑا خاص آدمی ہے میرا۔ اس کی حفاظت کا خیال رکھنا۔ اور ہاں.......... تیرا کوئی ایسا جاننے والا بھی ہو گا' جو اس طرف آباد ہونے میں اس کی ہر ممکن مدد کر سکے۔ رمیش یہاں خاصا ویل آف رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ باہر جا کر رُلے۔"

"تُو اس کی بھی فکر نہ کر یار۔ میرے پاس بڑے کام کے بندے ہیں۔ تیرے دوست کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ نہ یہاں نہ وہاں۔ بس تُو انہیں میرے پاس بھیج دے۔"

"تھینک یو سوچ ڈیئر۔ کل وہ تیرے پاس پہنچ جائیں گے۔"

میرپور خاص کے افسر نے ریسیور رکھنے کے بعد چند لمحے سوچا۔ پھر اپنے چپراسی کو آواز دی۔ چپراسی آیا تو اس نے کہا۔ "ڈرائیور سے کہو، جیپ نکالے۔"

چند منٹ بعد وہ جیپ میں بیٹھا رانا میت سنگھ کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا۔

رانا اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے پوچھا۔ "سائیں مہاراج، بے وقت کیسے زحمت کی۔ مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

"نہیں رانا جی۔ کام تو میرا تھا۔"

"بولو سائیں مہاراج!"

"کام کیسا چل رہا ہے؟"

"فرسٹ کلاس!"

"اگلی کھیپ کب جا رہی ہے مال کی؟"

"اگلے ہفتے سائیں۔"

"اس بار دو بندے بھی ہوں گے مال کے ساتھ۔" افسر نے رانا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

رانا کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ "سائیں مہاراج، آج کل کا حال تو آپ جانتے ہو نا۔ سختی ہو رہی ہے بہت۔ حالات اچھے نہیں۔"

"میں سب جانتا ہوں۔" افسر نے ترش لہجے میں کہا۔ "ضرورت کی چیز لینے میں تو کوئی سختی نہیں کرتا۔ آٹا، چینی، چاول تو جاتا ہے نا۔ کون چیک کرتا ہے۔ سب سالے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور رانا جی، میں کوئی جاسوس نہیں بھجوا رہا ہوں اس پار۔"

"میں جانتا ہوں سائیں مہاراج پر........"

"ایک بات سن لو۔ تم جو مال ہمیشہ اُدھر بھجواتے ہو، وہ یہاں کا مال ہوتا ہے اور میں جو مال تمہیں لے جانے کو کہہ رہا ہوں، وہ اُدھر ہی کا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں مہاراج!" رانا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"وہ ایک ہندو ہے........ میرا دوست۔ اب ایسے حالات ہو گئے ہیں کہ وہ یہاں رہے گا تو مار دیا جائے گا۔ اسے سرحد پار کرانی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی ہوگی۔"

"اوہ........ یہ بات ہے۔ یہ تو پُن کا کام ہے سائیں!" رانا نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ "کیا نام ہے آپ کے دوست کا؟"

"رمیش۔" افسر نے بتایا۔ "اور ہاں رانا جی، وہ میرا بہت پرانا دوست ہے۔ یہاں بہت اچھا کھاتا کماتا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے، یہاں سے جانے والوں کا حشر اچھا نہیں ہوتا۔ ورنہ تو سارے ہندو اب تک سرحد پار کر چکے ہوتے۔ میں نہیں چاہتا کہ رمیش وہاں جا کر خوار ہو۔ میں جانتا ہوں کہ اس پار بھی تمہارے بڑے تعلقات ہیں۔ تم کوشش کرو گے تو وہاں رمیش کو روزگار کا، رہنے سہنے کا مسئلہ نہیں ہوگا۔ رمیش کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہے۔ بچہ کوئی نہیں ہے ان کا۔"

"آپ فکر نہ کرو سائیں مہاراج، اسے وہاں بڑے لاڈ سے رکھا جائے گا۔ بس وہ آئیں تو آپ انہیں میرے پاس بھجوا دو۔ جانے تک وہ میرے مہمان رہیں گے۔"

افسر کے جانے کے بعد رانا سیدھا گھر گیا۔ "دیپا........ اپنے ہاں دو مہمان آنے والے ہیں۔" اس نے بیوی سے کہا۔ "پتی پتنی ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہندو ہیں۔ تُو عورت کو اچھی طرح سے ٹٹولنا۔ میں اس معاملے میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ عورت کو پرکھ کر پتا چل سکتا ہے کہ وہ ہندو ہیں یا نہیں۔"

دیپا نے کہا۔ "تو تمہیں ان کے دھرم کی چنتا کیوں ہے۔ ہوتے رہیں کچھ بھی۔"

"تُو نہیں سمجھتی۔ انہیں سرحد پار بھجوانا ہے۔ بڑے صاحب کا حکم ہے۔"

"اوہ کوئی بات نہیں۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ دیپا تو اڑتی چڑیوں کے پر گن لیتی ہے۔"

☆======☆======☆

منصور اور رابعہ عوام ایکسپریس میں سفر کر رہے تھے۔ چاروں بہنیں، بہنوئی اور بھانجے بھانجیاں انہیں رخصت کرنے کینٹ اسٹیشن آئے۔ سب خوش تھے کہ نوبیاہتا جوڑا ہنی مون پر جا رہا ہے۔ "تم اتنے مصروف ہو گے کہ خط لکھنے کا وقت تو نہیں ملے گا۔" فرحت نے منصور کو چھیڑا۔

"نہیں آپا' میں کوشش کروں گا خط لکھنے کی۔" منصور نے سنجیدگی سے کہا۔ اس پر سب ہنس پڑے۔

وہ دونوں حیدر آباد اترے اور میرپور خاص جانے والی بس میں بیٹھ گئے۔ ان کے پاس سامان زیادہ نہیں تھا۔ "ایک بات بتاؤں۔" سفر کے دوران رابعہ نے کہا۔ "شروع میں تو مونچھیں تم پر بہت بری لگی تھیں مگر اب اچھے لگ رہے ہو۔"

"تمہیں تو میں ہر حال میں اچھا لگوں گا۔" منصور نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہاری بات کا اعتبار نہیں۔"

کوئی انہیں غور سے دیکھتا تو سمجھ لیتا کہ وہ بہت نروس ہیں۔ ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔ وہ ایک بے یقینی کی کیفیت سے دوچار تھے۔ خدا ہی جانتا تھا کہ جو کچھ انہوں نے سوچا اور چاہا ہے' ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ اور یہ بات ان کے لئے بہت زیادہ اہم تھی۔

"ہم دنیا کا سب سے زیادہ انوکھا ہنی مون منانے جا رہے ہیں۔" منصور نے سرگوشی میں کہا۔

"اور سب سے مقدس بھی۔" رابعہ بولی۔

انہیں اس افسر کے گھر پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی' جس کا کارڈ منصور کو ذوالفقار کے افسر دوست نے دیا تھا۔ افسر نے بڑے تپاک سے ان کا خیرمقدم کیا۔ "نہا دھو کر کھانا کھاؤ۔ آرام کرو۔" افسر نے کہا۔ "رات یہیں گزارو۔ صبح میں تمہیں رانا میت سنگھ کے پاس پہنچا دوں گا۔ سرحد پار کرنے تک تمہیں وہیں رہنا ہوگا۔ اور ہاں........ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم یہاں پوری طرح محفوظ ہو۔"

کھانے کے بعد افسر دیر تک منصور سے اس کے اور رابعہ کے بارے میں پوچھتا رہا۔ یہ ضروری تھا۔ رانا کو اس نے بتایا تھا کہ رمیش اس کا بہت پرانا دوست ہے۔ اس لئے وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔

سونے کے موقعے پر انہیں تنہائی ملی۔ رابعہ نے کہا۔ "جان........ اب کٹھنائیوں کا سفر شروع ہو رہا ہے۔" وہ گجراتی میں بات کر رہی تھی تاکہ منصور رواں ہو جائے اور اسے حجاب نہ رہے۔ "اب ہمیں تمام اچھی باتیں چھوڑنا پڑیں گی۔ ہم زبان سے بسم اللہ

بھی نہیں کہہ سکیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ دل کی دھڑکن تو اللہ کا نام لیتی رہے گی۔" منصور نے بھی گجراتی میں کہا۔ "اور اللہ دل کا حال جانتا ہے۔"

دونوں بیٹھ کر اپنی کہانی پکی کرتے رہے۔ اب وہ جس مرحلے میں داخل ہو رہے تھے' اس میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جانے کس وقت انہیں نیند آ گئی۔ صبح افسر خود انہیں جیپ میں بٹھا کر رانا میت سنگھ کے ڈیرے پر چھوڑ آیا۔

☆======☆======☆

پورا دن رابعہ دیپا رانی کے ساتھ رہی اور منصور ڈیوڑھی میں رانا کے پاس بیٹھا رہا۔ رانا اس کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتا رہا۔ "میں سب کچھ اس لئے جاننا چاہتا ہوں کہ میں سرحد پار اپنے کچھ دوستوں کے نام اور پتے لکھ کر تمہیں دے دوں گا۔ وہ تمہاری سہائتا کریں گے۔" اس نے وضاحت کی۔

منصور مطمئن تھا کہ اس کی کہانی پکی ہے۔

"تم پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔" رانا نے کہا۔

"جی ہاں۔ میں نے بی ایس سی کیا ہے۔"

"کام کیا کرتے تھے؟"

"کنسٹرکشن کمپنی میں تھا۔ بس انجینئرنگ کی ڈگری نہیں ہے میرے پاس۔ ویسے کسی انجینئر سے کم نہیں ہوں۔ سپروائزر تھا میں۔"

رانا متاثر نظر آنے لگا۔ "یہی تو میں سوچتا تھا۔ سائیں مہاراج کا دوست کوئی ایسا ویسا نہیں ہو سکتا۔ اچھا......... یہ تو بتاؤ۔ تم دونوں کے گھر والے۔"

"ہم دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔" منصور نے آہ بھر کر کہا۔ "ہمارے ماتا پتا کا بچپن میں ہی دیہانت ہو گیا تھا۔ بھائی بہن بھی کوئی نہیں۔"

"بڑا کٹھن جیون بتایا ہے۔"

"ہاں مہاراج۔ شاید یہی چیز ہمیں ایک دوسرے کی طرف کھینچ لائی۔ ہم نے سوچا تھا' اپنا الگ سنسار بنائیں گے۔"

"تمہیں پگار کتنی ملتی تھی؟"

"آٹھ ہزار۔"

"ایک بات بتاؤ۔ تم جانتے ہو کہ یہاں سے وہاں جانے والے بڑا کشٹ اٹھاتے ہیں۔

پھر تم اتنا اچھا روزگار چھوڑ کر وہاں رُلنے کیوں جا رہے ہو۔"

"اب ہم یہاں رہ نہیں سکتے۔" منصور نے آہ بھر کر کہا۔

"کیوں......... ایسا کیا ہو گیا؟"

"شہر میں ایک بڑا آدمی میری رابو کے پیچھے پڑ گیا تھا........."

"رابو؟ کون رابو؟"

"میں ریکھا کو پیار سے رابو کہتا ہوں۔" منصور نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"وہ بڑا اثر رسوخ والا آدمی ہے' غنڈے بھی پال رکھے ہیں اس نے۔ پولیس پر بھی بڑا زور ہے اس کا۔ اس نے کئی بار رابو کو پٹانے کی کوشش کی۔ رابو نے جھڑک دیا۔ آخری بار اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے مروا دے گا۔ پھر دیکھے گا' رابو اس کی ہوتی ہے یا نہیں۔"

"آدمی پرائے لوگوں میں ہو تو اسے دبنا ہی پڑتا ہے۔" رانا نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"دبنے میں کوئی برائی نہیں۔ پر عزت تو نہیں دے سکتے ہم۔" منصور نے بپھر کر کہا۔

"اچھا تمہارے پاس شناختی کارڈ اور پاسپورٹ تو ہوں گے؟" رانا نے اچانک پوچھا۔

"ہاں۔ ہیں۔"

"تو وہ مجھے دے دو۔ انہیں لے کر سرحد پار نہ کرنا۔ یاد رکھو' تم وہاں غیرقانونی طور پر جا رہے ہو۔"

منصور اٹھا۔ اس نے سوٹ کیس میں سے اپنا اور رابعہ کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ نکال کر رانا کو دے دیا۔ رانا نے چاروں چیزیں دیکھے بغیر جیب میں ڈال لیں۔ "اچھا رمیش کاکا' تم آرام کرو۔ میں ذرا دو ایک کام نمٹا لوں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو راجو کو آواز دے لینا۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے گا۔"

☆======☆======☆

خوش قسمتی سے دیپا نے ان کے سونے کا بندوبست علیحدہ کمرے میں کر دیا تھا ورنہ پورے دن تو وہ ایک دوسرے کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔ دونوں سونے کے

لئے لیٹنے لگے تو رابعہ نے سرگوشی میں کہا۔ "یہاں زور سے نہ بولنا۔"

"کیوں' کیا بات ہے؟" منصور نے پوچھا۔

"یا تو ان لوگوں کو ہم پر شک ہے یا پوری طرح تصدیق کرنا چاہتے ہیں۔" رابعہ بدستور سرگوشی میں بات کر رہی تھی۔ "دیپا نے دن بھر مجھ پر نظر رکھی۔ میری بول چال' چال ڈھال' انداز و اطوار سب دیکھتی رہی۔ میرے متعلق سب کچھ پوچھا اور ایسی باتیں بھی پوچھیں' جن کا جواب صرف ایک ہندو لڑکی ہی دے سکتی ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ لوگ پوری طرح مطمئن ہو جائیں گے تو سرحد پار والوں کو بھی مطمئن کر دیں گے۔" منصور نے اسے سمجھایا۔ "تم دیپا کا دل مٹھی میں لینے کی کوشش کرو۔"

"تم مطمئن رہو۔ بس ذرا تم محتاط رہنا۔"

"اتنا محتاط تو میں زندگی میں کبھی نہیں رہا۔"

دوسری طرف رانا میت سنگھ اور دیپا انہی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ دیپا' ریکھا کے گن گا رہی تھی۔ "میں تو سوچتی رہی کہ بھگوان نے ایسی بیٹی کیوں نہ دی۔ بڑی گنوں والی ہے۔ سمجھ دار......... سگھڑ........."

"میں نے تم سے کچھ اور کہا تھا۔" رانا نے ترشی سے کہا۔

"تم بے فکر ہو جاؤ۔ وہ ہندو ہے۔"

"اتنے وشواس سے کیسے کہہ رہی ہو؟"

"میں نے دن بھر اسے پرکھا ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں' جو وہی لڑکی جان سکتی ہے' جو ہندو گھر میں پیدا ہوئی ہو۔ ایسی باتیں تو کوئی مرد بھی نہیں جان سکتا۔ تمہیں بھی پتہ نہیں ہوں گی۔"

"ایسی کون سی بات ہے جو مجھ گیانی کو پتہ نہیں؟" رانا نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔

"بڑے آئے گیانی بن کر۔ تمہیں تو کچھ بھی پتہ نہیں۔" دیپا نے اٹھلا کر کہا۔

"جانتی ہو' اس لڑکے سے باتیں کر کے میں نے بھی وہی سوچا' جو تم نے سوچا تھا۔

بڑا گنی لڑکا ہے۔ کاش میرا بیٹا ہوتا۔" رانا نے کہا۔ اب وہ بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ "مگر دیپو' تم آرام سے نہ بیٹھ جانا۔ پھر بھی اس پر نظر رکھنا۔"

"تم بے فکر رہو سوامی!"

☆======☆======☆

چار دن بعد رانا میت سنگھ نے قریبی بھارتی سرحدی چوکی کا رخ کیا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ مال بھیجنے سے پہلے وہ چوکی سے رابطہ ضرور کرتا تھا۔ اس چوکی کا چارج کیپٹن ہردیال کے پاس تھا۔ کیپٹن ہردیال رانا کو خاصے عرصے سے جانتا تھا۔

رانا نے کیپٹن سے رمیش اور ریکھا کی بات کی۔ "نہ شریمان جی' میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔" کیپٹن نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

رانا نے اسے رمیش کے حالات بتائے۔ اس نے جیب سے ان دونوں کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ نکال کر سامنے ڈال دیئے۔ "دیکھو کپتان جی' میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں ان دونوں کو مدت سے جانتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ اس طرف میرا کیا اثر رسوخ ہے مگر میں بھی انہیں نہیں بچا سکتا۔ وہ جس خطرے میں گھِرے ہوئے ہیں' اس سے بچاؤ کی یہی صورت ہے۔ تمہیں ان پر دیا کرنی ہوگی۔"

"تم سمجھ نہیں رہے ہو شریمان جی۔ یہ سیکیورٹی کا معاملہ ہے۔"

"دیکھو......... تم یہ کام نہیں کرو گے تو میں کسی اور سے کروا لوں گا۔ بھگوان داس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔" رانا کے لہجے میں موہوم سی دھمکی تھی۔

بھگوان داس غلے کا بہت بڑا آڑھتی تھا۔ یہ کاروبار تھا بھی اسی کا۔ پاکستان سے اسمگل ہونے والا غلہ بھگوان داس کے ہی گوداموں میں جاتا تھا اور بھگوان داس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ یہ بات کیپٹن ہردیال جانتا تھا۔ کیپٹن کو اوپر کی یہ آمدنی بہت عزیز تھی۔ جو شخص اسے چند منٹ آنکھیں بند رکھنے کا بھاری معاوضہ دیتا تھا' وہ چند ہی منٹ میں اس کا تبادلہ بھی کرا سکتا تھا۔

"اچھا میں سوچوں گا۔" کیپٹن ہردیال نے کہا۔

"سوچنے کا وقت کہاں کپتان جی۔ مال تو کل سرحد پار کرے گا۔" رانا میت سنگھ نے کہا۔

"اگلی کھیپ کے ساتھ بھجوا دینا ان دونوں کو۔ اس بار رہنے دو۔"

"جائیں گے تو وہ اسی کھیپ کے ساتھ۔" رانا بولا۔ "کہو تو اس کھیپ کو رکوا دوں۔ جب تم کہو گے، چلی جائے گی۔"

کیپٹن ہردیال گھبرا گیا۔ "تم بھیج دینا دونوں کو۔" اس نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ مال لیٹ ہوا اور بھگوان داس کو اس کی وجہ معلوم ہوئی تو اس کی خیر نہیں ہوگی، پھر یہ مال دیش کے ہی کام آئے گا۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ یہ سلسلہ بند ہو جائے تو دیش میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کہاں کی کہاں پہنچ جائے گی اور مہنگائی حد سے بڑھ گئی تو لوگ بھوکے مریں گے اور بھوکے مرنے والے اٹھ کھڑے ہوں تو دھرتی بھی ہل جاتی ہے۔ میں تو دیش سیوا کر رہا ہوں۔

"تم نے بڑی دیا کی ہے کپتان مہاراج۔" رانا میت سنگھ نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ دل ہی دل میں وہ ہنس رہا تھا۔

☆======☆======☆

اس رات رانا میت سنگھ نے منصور سے تفصیلی بات کی۔ "کل رات یہاں سے مال سرحد پار جا رہا ہے۔ تم اپنی پتنی کے ساتھ کل سرحد پار کر جاؤ گے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ چوکی پر بھی بات کر لی ہے۔"

منصور کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا۔ "سچ رانا جی۔ میں واقعی اس پوتر دھرتی کو چوم سکوں گا؟"

رانا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "اب کوئی دھرتی پوتر نہیں رہی بیٹا۔ دھرتی کی پوترتا تو منشوں سے ہوتی ہے اور یہ کل جگ کے منش......... خیر، چھوڑو اس بات کو۔ میری بات دھیان سے سنو۔ میں نے اپنے دوست بھگوان داس کے نام یہ پتر لکھ دیا ہے۔" اس نے ایک خط منصور کی طرف بڑھایا۔ "یہ احتیاط سے رکھ لو۔ اسے دے دینا۔ بڑا اثر والا آدمی ہے۔ ہر طرح سے تمہاری سہائتا کرے گا۔ تمہیں مکان بھی دلوا دے گا۔ روزگار سے بھی لگا دے گا۔ لوگوں سے بھی ملوا دے گا۔ بھگوان تمہیں شانت رکھے۔" اس کے لہجے میں اداسی در آئی۔ "تم سے کچھ من مل گیا تھا۔ میں تمہیں یہیں بچا کر رکھ سکتا تو کبھی وہاں نہ بھجواتا۔ وہاں سے خط پتر بھیجتے رہنا۔"

"آپ نے بڑی کرپا کی ہے رانا مہاراج!" منصور نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

رانا میت سنگھ اپنے آنسو چھپانے کے لئے اٹھ کر چلا گیا۔

اندر رابعہ اور دیپا کے درمیان بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

نصرت کو اسلام آباد سے منصور کا خط موصول ہوا۔ منصور نے لکھا تھا کہ اس نے اچانک ہی فرانس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ویزا مل چکا ہے اور خط پہنچنے تک وہ اور رابعہ پیرس کے لئے پرواز کر چکے ہوں گے۔ ایک دو ماہ میں واپسی ہوگی۔ نصرت نے تینوں بہنوں کو مطلع کر دیا۔

منصور نے روانہ ہونے سے پہلے وہ خط اسلام آباد میں اپنے ایک دوست کو اس ہدایت کے ساتھ بھجوایا تھا کہ وہ دو ہفتے بعد اس خط کو پوسٹ کر دے گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بہنیں فوری طور پر اس کے لئے پریشان ہوں۔ آئندہ کے لئے بھی اس نے بندوبست کر لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی تلاش شروع ہو۔

☆======☆======☆

رات ساڑھے گیارہ بجے وہ دونوں رانا میت سنگھ اور دیپا کو الوداع کہہ کر نکل آئے۔ قافلہ تیار تھا۔ انہیں اونٹوں پر سفر کرنا تھا مگر ان کے لئے تو اونٹ پر بیٹھنا ہی دوبھر ہو گیا۔ رابعہ ڈر رہی تھی۔ چنانچہ اسے منصور کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔

رانا اور دیپا نم آنکھوں سے انہیں جاتا دیکھتے رہے۔

وہ دونوں خوش بھی تھے اور ان کے دلوں میں اندیشے بھی سرسرا رہے تھے۔ اب انہیں جتنا عرصہ بھی رہنا تھا، پردیس میں رہنا تھا اور وہ جانتے تھے کہ یہ آسان کام نہیں۔ ذرا سی لغزش بھی سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی۔ وہ دونوں چپکے چپکے، دل کی گہرائیوں سے اللہ سے مدد اور نصرت طلب کر رہے تھے۔

اونٹ کی سواری نے ان کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے۔ پہلی بار ان کی سمجھ میں آیا کہ اونٹ کو ریگستان کا جہاز کیوں کہا جاتا ہے۔ ٹھیک بارہ بجے وہ سرحد پار کر کے ہندوستان کی حدود میں داخل ہوئے۔ راستے میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب وہ ایک آبادی کے قریب پہنچے لیکن قافلہ آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد انہیں ایک ٹرک کی ہیڈلائٹس دکھائی دیں۔ پھر وہ روشنیاں تین بار جلی بجھیں۔ اونٹ ٹرک کی طرف بڑھتے رہے۔ بالآخر قافلہ رک گیا۔

اونٹ سے اترتے ہوئے منصور اور رابعہ کو ایسا لگا کہ وہ ڈھے جائیں گے۔ ان کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ قافلے کا لیڈر ٹرک کے ساتھ کھڑے ڈرائیور کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "بوریاں ٹرک پر چڑھا دو۔"

منصور اور رابعہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔ انہیں اپنے دل کی دھڑکن کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ٹرک ڈرائیور نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ "کتنی بوریاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ڈیڑھ سو ہیں بنسی دھر۔ گنتی پوری کر لو۔"

بنسی دھر نے اپنے کلینرز کو پکارا۔ "او رامو.........بوریاں گن لے۔"

"اور بنسی دھر' میرے ساتھ بھگوان داس جی کے دو مہمان بھی ہیں۔" قافلے کے لیڈر نے منصور اور رابعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انہیں عزت کے ساتھ بھگوان داس جی تک پہنچانا ہے۔ کوئی تکلیف نہ ہو انہیں۔ یہ رانا جی کا حکم ہے۔"

بنسی دھر نے انہیں غور سے دیکھا اور ہنسنے لگا۔ "تکلیف میں تو یہ پہلے ہی معلوم ہوتے ہیں۔"

"اونٹ پر بیٹھنے کی عادت جو نہیں ہے۔" لیڈر نے کہا۔ پھر منصور کو پکارا۔ "شریمان جی' یہاں چلے آیئے۔"

منصور اور رابعہ ان کی طرف چلے آئے۔ "یہ بنسی دھر ہے۔ آپ کو بھگوان داس جی کے پاس پہنچا دے گا۔ آپ کوئی چنتا نہ کرنا۔" لیڈر نے کہا۔

منصور اور رابعہ نے بنسی دھر کو نمسکار کیا۔ "یہ بستی کون سی تھی' جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں؟" منصور نے پوچھا۔

"یہ جلور تھی۔" بنسی دھر نے بتایا۔

"اور ہمیں جانا کہاں ہے؟"

"اندور' بھگوان داس جی کے گودام وہیں ہیں۔ ویسے وہ رہتے جبل پور میں ہیں۔"

دس منٹ میں تمام بوریاں ٹرک پر لاد دی گئیں۔ کارواں واپس چل دیا۔ "او رامو رے!" بنسی دھر نے اپنے کلینرز سے کہا۔ "تو پیچھے بوریوں پر بیٹھ جا رے۔ آگے مہمان بیٹھیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے ان دونوں کے لئے ٹرک کا دروازہ کھولا۔ پہلے منصور بیٹھا پھر رابعہ۔ بنسی دھر نے دروازہ بند کیا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

نئے دور کا سفر شروع ہو گیا تھا!

☆======☆======☆

۳۱ مارچ ۹۲ء کا سورج انہوں نے اندور میں ابھرتے دیکھا۔

ٹرک ایک بڑے گودام کے سامنے رکا۔ دروازے پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ بنسی دھر دروازہ کھول کر اترا۔ "لو منشی جی۔ ڈیڑھ سو بوریاں ہیں۔ اپنے کارندے بلا کر اتروا لو۔" اس نے کہا۔ "اور مجھے پیسے دے دو۔"

منشی نے دھوتی کی انٹی میں سے نوٹ نکالے اور کچھ نوٹ گن کر بنسی دھر کی طرف بڑھا دیئے۔ "اور یہ لوگ کون ہیں؟" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"غیرضروری باتیں مت پوچھا کرو منشی جی!" بنسی دھر بولا۔ "یہ بھگوان داس جی کے مہمان ہیں۔"

منشی گودام میں گیا اور خلاصیوں کو بلا لایا۔ ٹرک سے مال اتارا جانے لگا۔ بنسی دھر منصور اور رابعہ کی طرف چلا آیا۔ "آیئے میں آپ لوگوں کو بھگوان داس جی کے پاس پہنچا دوں۔" وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ انہوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ ایک سنسان علاقہ تھا۔ فضا میں کچھ خنکی تھی لیکن خوشگوار لگ رہی تھی۔ وہ موسم بہار تھا۔

"تھوڑا پیدل چلنا پڑے گا۔" بنسی دھر نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "ادھر ٹرک لے جانا مناسب نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" منصور نے کہا۔

وہ دونوں اس کے ساتھ چل دیئے۔ کوئی ڈیڑھ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد آبادی شروع ہو گئی۔ پکے مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بنسی دھر انہیں لے کر ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی خاصی کشادہ تھی۔ تیسرے مکان کے دروازے پر وہ رک گیا اور دستک دی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک معمر لیکن تومند

شخص تھا۔ بنسی دھر نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ منصور اور رابعہ اوٹ میں کھڑے تھے۔

"کیا ہے رے بنسی دھر؟ مال لے آیا؟"

"جی مہاراج!"

"حساب ہو گیا تیرا؟"

"جی مہاراج' ادھر سے رانا جی نے دو مہمان بھیجے ہیں آپ کے پاس۔ انہیں چھوڑنے آیا تھا۔" بنسی دھر نے کہا اور منصور سے بولا۔ "سامنے آؤ نا۔"

منصور اور رابعہ آگے بڑھے۔ دونوں نے بھگوان داس کو نمسکار کیا۔ بھگوان داس حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور ایک طرف ہٹ کر انہیں راستہ دیتے ہوئے بے حد خوش خلقی سے کہا۔ "پدھاریئے شریمتی جی......... شریمان جی۔ دھنیہ واد ہو۔" وہ بنسی دھر کی طرف مڑا۔ "تو جا رے۔"

وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ بھگوان داس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور انہیں کمرے میں لے گیا۔ وہ بے حد آراستہ ڈرائنگ روم تھا۔ مکان کی بیرونی حالت کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہاں ایسا کوئی کمرا بھی ہوگا۔

بھگوان داس نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ منصور نے جیب سے رانا میت سنگھ کا رقعہ نکال کر احترام سے اس کی طرف بڑھایا۔ پھر وہ صوفے پر رابعہ کے برابر جا بیٹھا۔

بھگوان داس خاموشی سے رقعہ پڑھتا رہا۔ پھر اس نے رقعہ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اس بار اس نے انہیں دیکھا تو اس کے انداز میں اپنائیت تھی۔ "تمہارے آنے سے خوشی ہوئی۔" اس نے کہا۔ "رانا میرا بڑا اچھا متر ہے۔ تم لوگ بہت اچھے ہو گے۔ پتھر کے من میں جوت جگا کر آئے ہو۔ میت سنگھ پریم کرنے والا آدمی نہیں۔ اب تم چنتا نہ کرو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ تم لوگ سکھی رہو گے۔ یہی تمہارا دیش ہے اب۔"

منصور نے بڑے انکسار سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

بھگوان داس تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "میرا بیوپار بہت پھیلا ہوا ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو۔ میرا بیوپار سنبھال لو۔ مکان موجود ہے۔ یہیں رہنا۔ میں تو یہاں کبھی کبھار ہی آتا

ہوں۔ گھر میرا جبل پور میں ہے۔"

"آپ کی بڑی کرپا مہاراج۔ مگر میں کنسٹرکشن کا آدمی ہوں۔ بیوپار میں چل نہیں سکوں گا۔" منصور نے معذرت کی۔

"تو پھر یوں کرو دو تین دن یہاں رکو۔ پھر میرے ساتھ جبل پور چلنا۔ میرے ایک دوست کا بڑا کاروبار ہے کنسٹرکشن کا۔ میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔"

☆======☆======☆

جبل پور کا سفر انہوں نے بھگوان داس کی کار میں کیا۔ منصور اگلی سیٹ پر بھگوان داس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ رابعہ پچھلی سیٹ پر تھی۔ بھگوان داس منصور سے اس کے بارے میں پوچھتا رہا۔ "تم لوگ زبان کون سی بولتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"گجراتی۔" منصور نے جواب دیا۔

"ہوں۔ دیکھو' وہاں خود کو احمد آباد کا بتانا۔ تم لوگ یہاں غیر قانونی طور پر آئے ہو۔ یہ بات کسی کو نہیں بتانا۔"

"جی بہتر۔"

"اور ہاں......... تمہارے تعلیمی سرٹیفکیٹ بھی نہیں چلیں گے۔ سمجھو' یہاں تم ان پڑھ ہو۔"

"تو پھر مجھے کنسٹرکشن کمپنی میں کام کیسے ملے گا؟" منصور نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"اس کی تم چنتا نہ کرو۔ رام پرشاد میرا بڑا اچھا متر ہے۔ وہ تمہیں کام دے دے گا۔ پھر تم اپنی قابلیت دکھا دینا۔"

جبل پور پہنچ کر بھگوان داس نے منصور کو دس ہزار روپے دیئے۔ منصور نے لینے سے انکار کیا تو وہ بولا۔ "یہ تمہارے ہی ہیں۔"

"وہ کیسے مہاراج؟"

"تم نے رانا کو دس ہزار پاکستانی روپے دیئے تھے۔"

منصور کو یاد آ گیا۔ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ لینے کے بعد اگلے روز رانا نے اس سے پوچھا تھا' کچھ لے کر بھی آئے ہو یا خالی ہاتھ بھاگے ہو۔ اس پر منصور نے اسے بتایا تھا کہ

اس کے پاس عمر بھر کی بچت کے دس ہزار ہیں۔ رانا نے کہا تھا۔ "وہ مجھے دے دو۔ تمہیں اس کے بدلے بھارت میں بھارتی کرنسی کی شکل میں مل جائیں گے۔"

"اس کے علاوہ بھی ضرورت پڑے تو مانگ لینا۔" بھگوان داس نے کہا۔

بھگوان داس نے ان کا ہر مسئلہ حل کر دیا۔ اس نے انہیں آریہ محلے میں دو کمروں کا ایک مکان دلا دیا۔ پھر اس نے منصور کو لے جا کر رام پرشاد سے ملوایا۔ اس کے نتیجے میں منصور کو رام داس کنسٹرکشن کمپنی میں سپروائزر کی حیثیت سے ملازمت بھی مل گئی۔ پڑوس میں دو گھر گجراتیوں کے بھی تھے۔ وہ لوگ راج کوٹ کے رہنے والے تھے۔ جلد ہی ان میں مراسم ہو گئے۔ یوں سوشل لائف شروع ہو گئی جو آدمی میں خود اعتمادی ابھارتی ہے۔

زندگی مدھر سُروں میں بہتی رہی۔

منصور کنسٹرکشن کمپنی میں تیزی سے اپنا مقام بنا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بھگوان داس نے رام پرشاد کو اس کے بارے میں کیا کچھ بتایا ہے لیکن یہ طے ہے کہ رام پرشاد اس پر خاص طور سے مہربان تھا۔ ایک بار باتوں باتوں میں وہ کہہ چکا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ رمیش تعلیم یافتہ بھی ہے اور قابل بھی۔

کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ منصور کی رسائی کمپنی کے اسٹور روم تک ہو گئی۔ موقع ملتے ہی منصور نے اسٹور سپروائزر ارجن داس سے دوستی گانٹھ لی۔ یہ بات بہت اہم تھی کیونکہ اسٹور روم میں آتش گیر مادہ موجود رہتا تھا اور اس کی منصور کو ضرورت تھی۔

اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کا کام بہت تیزی سے جاری تھا۔ اردگرد کے شہروں میں آئے دن مسلم کش فسادات ہوتے رہتے تھے۔ مسلمان رہ رہ کر بابری مسجد کے مقام کی طرف مارچ کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن پولیس کی فائرنگ انہیں روک دیتی۔ مندر کی تعمیر کا کام فوج کے تحفظ میں ہو رہا تھا۔

اپنی جگہ سب کچھ ٹھیک تھا مگر منصور اور رابعہ ایک گھٹن کے شکار تھے اور وہ بہت بڑی گھٹن تھی۔ وہ شدید خواہش کے باوجود اولاد کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ اس سے گریز پر مجبور تھے۔ اس ماحول میں، جہاں وہ ہندو بن کر رہنے پر مجبور تھے، وہ اپنے بچوں کو کیسے پالتے؟ ان کے بچے ہندو ہو جاتے لیکن آرزو تو اپنی جگہ تھی۔

"اللہ......... میں نے کیسا کیسا سوچا تھا کہ اپنے بچوں کی تربیت کروں گی۔" رابعہ تڑپ کر کہتی۔ "انہیں مثالی مسلمان بناؤں گی۔ تم پر ثابت کروں گی کہ نومسلم ماں کی گود میں تربیت پا کر بھی بچے مومن ہو سکتے ہیں۔"

"اب کیوں شرمندہ کرتی ہو۔" منصور اسے بانہوں میں سمیٹ لیتا۔ "یہ اعتماد نہ ہوتا تو میں تم سے شادی ہی نہ کرتا۔"

"کتنی بڑی مجبوری ہے ہماری۔ منصور، میں مر جاؤں گی۔ مجھے ایک بیٹا تو چاہئے......... تم جیسا۔"

"بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ کیا مجھے اولاد کی آرزو نہیں۔ میں تو اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میرے ساتھ میرے آباؤ اجداد کی نسل بھی ختم ہو جائے گی لیکن میری جان، ہم تو ایک بہت بڑے مقصد کے لئے نکلے ہیں۔ ہماری منزل تو شہادت ہے اور اگر ہمارے بچے ہوئے تو یہ سوچو کہ ہمارے بعد ان کا کیا ہوگا۔ یہ قربانی تو ہمیں دینی ہی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" رابعہ آہ بھر کر کہتی۔ "شکر کا مقام ہے کہ اللہ کی تائید ہمارے ساتھ ہے۔ یہاں کتنی مشکلیں تھیں جو اس کی رحمت سے آسان ہو گئیں۔"

"واقعی......... اللہ کی تائید نہ ہوتی تو یہاں اس طرح قدم جمانا تو درکنار، یہاں تک پہنچ بھی نہیں سکتے تھے۔"

پھر کمپنی میں ایک نیا آرکیٹکٹ آیا۔ رام پرشاد نے بڑی تنخواہ کا لالچ دے کر اسے توڑا تھا، اور یہ وہ شخص تھا جس نے اجودھیا کے نئے رام مندر کا نقشہ بنایا تھا۔ منصور بہت تیزی سے اس کے قریب ہوا۔ نیا آرکیٹکٹ رندھیر بھی اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ نقشوں کے متعلق منصور کی سوجھ بوجھ نے اسے حیران کر دیا تھا۔ "تم تو پیدائشی آرکیٹکٹ معلوم ہوتے ہو۔" وہ اکثر کہتا۔

ایک دن منصور نے اس سے کہا۔ "میں آرکیٹکٹ نہ سہی، لیکن ایک نہ ایک دن ایسا مندر ڈیزائن کروں گا کہ دنیا حیران رہ جائے گی۔ ایسا مندر بھارت میں تو کیا پورے سنسار میں دوسرا نہیں ہوگا۔"

"اب تم ایسا نہیں کر سکتے۔" رندھیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس لئے کہ میں ایسا ڈیزائن بنا چکا ہوں۔ رام مندر جیسا دوسرا مندر نہ تھا، نہ آئندہ بن سکے گا۔"

"واقعی! رام مندر کا نقشہ تمہارا بنایا ہوا ہے؟" منصور نے حیرت سے کہا۔ حالانکہ اسے یہ بات معلوم تھی۔

"اسی لئے تو رام پرشاد جی میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور انہوں نے مجھے میری کمپنی سے توڑ کے چھوڑا۔" رندھیر نے اکڑ کر کہا۔ "اور اب میں بھارت کا سب سے زیادہ تنخواہ پانے والا آرکیٹکٹ ہوں۔"

"مجھے بڑا اشتیاق ہے رام مندر کا بلیو پرنٹ دیکھنے کا۔"

"وہ تو اس وقت کا سب سے بڑا سرکاری راز ہے۔" رندھیر نے کہا۔

"میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس کی ایک کاپی اپنے لئے سنبھال کر رکھ لیتا۔"

رندھیر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ "لیکن وہ تو بہت بڑا جرم ہوتا۔"

"مگر میں اس اعزاز کو اپنا حق سمجھتا۔" منصور نے ضدی پن سے کہا۔ "اور پھر میں کسی کو بتاتا......یا وہ بلیو پرنٹ دکھاتا تو نہیں۔"

"مجھے بھی نہیں دکھاتے۔" رندھیر نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"تم وہ واحد آدمی ہوتے، جسے میں وہ بلیو پرنٹ دکھاتا۔"

"کیوں؟"

"ایک تو تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ دوسرے تم ہی اس کی داد دے سکتے تھے۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔

اگلے روز رندھیر نے منصور کو اپنے کمرے میں بلایا اور دروازہ بند کر لیا۔ "کل کی بات یاد ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔"

"تو پھر دل تھام کر بیٹھو۔ یہ ہے رام مندر کے بلیو پرنٹ کی کاپی۔" رندھیر نے اپنی دراز سے ایک فائل نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

منصور نے لرزتے ہاتھوں سے وہ فائل کھولی۔ اللہ کی تائید واقعی اس کے ساتھ تھی۔ وہ بلیو پرنٹ کا جائزہ لیتا رہا۔ وقتاً فوقتاً وہ کسی بات پر داد دیتا اور رندھیر مربیانہ انداز میں مسکرا دیتا۔ وہ خوش تھا کیونکہ ہر بار منصور کی داد برمحل تھی۔

منصور اس نقشے میں تہ خانوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ پورے نقشے میں وہی اس کے مطلب کی چیز تھی۔ وہ تمام کارآمد باتیں ذہن نشین کر رہا تھا۔ آخر میں اس نے فائل بند کر کے رندھیر کی طرف بڑھا دی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ایسا مندر نہ کبھی بنا ہے، نہ بنے گا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"نہیں یار، تم بہت ذہین آدمی ہو۔" رندھیر نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "مجھے وشواس ہے، ایک دن تم کوئی بہت بڑا کام کرو گے...... کبھی نہ بھلایا جانے والا کام۔"

منصور نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ تو میں کروں گا انشاء اللہ۔ زبان سے وہ بولا۔ "وہ کام تو تم کر چکے ہو۔"

اس شام گھر پہنچ کر اس نے وہ سب کچھ کاغذ پر نوٹ کر لیا۔ وہ محض احتیاط تھی۔ کیونکہ وہ تفصیلات اب اس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتی تھیں۔

چند روز بعد وہ کمپنی کے اسٹور سے ڈائنامیٹ اسٹکس چرا کر لایا۔ اس روز وہ بہت خوش تھا۔ اس نے منزل کی طرف جانے والے راستے پر پہلا قدم رکھ دیا تھا۔

☆======☆======☆

اکتوبر ۹۶ء

وقت کا دھارا بہتا رہا۔ موسم آتے جاتے رہے تھے لیکن ان کے لئے ہر موسم گھٹن کا موسم تھا اس لئے کہ وہاں ہر موسم کے ساتھ ایک تہوار بھی تھا۔ دسہرہ، دیوالی، ہولی۔ عید، بقرعید، شب برات، عید میلاد النبیؐ اور ہر تہوار کے ساتھ ایک جبر اور ہر خوشی کے ساتھ ایک بے بسی۔ ہندوانہ تہوار مناتے وقت وہ بے بسی کی آخری حد کو پہنچ جاتے تھے۔ منصور کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر اعلان کر دے اپنے مسلمان ہونے کا۔ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ دے لیکن ایسے ہر لمحے میں رابعہ اس کا ہاتھ تھام لیتی۔ اس کے ہاتھوں کا لمس منہ سے بولتا۔ اسے حوصلہ دیتا۔ یاد دلاتا کہ وہ ایک بہت بڑے مقصد کے لئے نکلا ہے...... ایسا مقصد جس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی ہے۔ اس لمس کی تسلی سے اس کا دل پگھلنے لگتا۔ آنسو آنکھوں سے ابل آتے۔ ایسے میں وہ سختی سے آنکھیں بھینچ لیتا کہ آنسو باہر نہ آ جائیں۔

عید اور بقر عید پر اس کی حالت اور بری ہوتی۔ جماعت سے نمازِ عید پڑھنے کو اس کا دل تڑپتا۔ اس پر وحشت طاری ہو جاتی۔ وہ گھر پر ہی عید کی نماز پڑھتا اور گڑگڑا کر خدا سے دعا کرتا کہ اس کی مجبوری کے پیشِ نظر اس کی یہ نماز قبول فرمالے۔ وہ اور رابعہ گھر کسی صاف چادر کی جانماز بنا کر نماز پڑھتے رہتے تھے۔ اس عرصۂ اذیت میں منصور کو پتہ چلا کہ عورت کتنی مضبوط ہوتی ہے۔ رابعہ کا سہارا نہ ہوتا تو اب تک وہ ٹوٹ چکا ہوتا......... بکھر چکا ہوتا۔

اس دوران ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہندو بابری مسجد کے معاملے میں اپنے مؤقف پر ڈٹے ہوئے تھے اور مسلمان اس زمین سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ بھارت کا اندرونی خلفشار آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ تقریباً ہر صوبے میں علیحدگی کی تحریکیں سر اٹھا چکی تھیں......... اتنا زور پکڑ چکی تھیں کہ اب انہیں روکنا دشوار تھا۔ معتدل مزاج ہندوؤں نے بہت کوشش کی تھی کہ باعزت تصفیہ کر لیا جائے لیکن متعصب ہندوؤں پر جنون طاری تھا۔ بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ ۶ دسمبر ۹۲ء کے بعد سے اب تک فسادات میں اور پولیس اور فوج کے ہاتھوں شہید ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچنے والی تھی۔ رام مندر کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ اسے پوجا کے لئے کھول دیا گیا تھا......... لیکن فوج کے تحفظ میں۔ حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ مسلمانوں کو مندر کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا جا رہا تھا۔

منصور پر جب بھی گھٹن طاری ہوتی، وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا کہ منزل بہت قریب آ گئی ہے۔ ڈائنامیٹ اسٹکس، پڈنگ، ڈیٹونیٹرز......... سب کچھ وہ خاصی تعداد اور مقدار میں جمع کر چکا تھا۔ یہ سب کچھ گھر میں بڑی حفاظت سے رکھا تھا لیکن اہم بات یہ تھی کہ ان پر کسی کو شک نہ ہو ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ محلے میں انہوں نے اپنی بہت اچھی ساکھ بنا رکھی تھی۔ گجراتی گھرانوں سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ تعلقات اس کے علاوہ بھی تھے۔ محلے کی تمام عورتیں اس بات کو بہت سراہتی تھیں کہ ریکھا ہر تہوار بڑی شان سے مناتی ہے۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ وہ مسلمان ہے اور باقاعدہ نماز پڑھتی ہے۔

عمل کی گھڑی قریب آ گئی تھی۔ اب کسی بھی وقت منصوبے پر عمل ہو سکتا تھا۔

لیکن اکتوبر کی اس صبح رابعہ بہت بجھی بجھی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کا تاثر تھا۔ وہ دونوں ناشتہ کرنے بیٹھے تو منصور نے اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کی۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔“ رابعہ نے کہا۔

ناشتے کے بعد منصور نے اس سے دوبارہ پوچھا۔ اس بار رابعہ نے کہا۔ ”ہاں......... ایک بات ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں۔“

منصور کے لئے وہ دھماکا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ کچھ دیر تو بول ہی نہ سکا پھر اس نے کہا۔ ”یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہارا اندازہ غلط ہو۔ دیکھو نا......... ایسی گڑبڑ......... میرا مطلب ہے، بے ترتیبی بھی تو ہو جاتی.........“

”پچھلے مہینے میں نے یہی سوچ کر نظرانداز کر دیا تھا۔ مگر اس بار......... نہیں جان، ہم حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتے۔“

منصور کو اچانک ہی اپنے اندر روشنی پھوٹتی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ پچھلے برسوں کا سارا فرسٹریشن دھل گیا ہے۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ”اری پگلی، تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ہمیں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔“

”لیکن جو مسائل کھڑے ہوں گے......... ہم جن باتوں سے ڈر رہے تھے.........“

”ہم تو بہت سی باتوں سے ڈر رہے تھے لیکن اللہ کی تائید سے سب کچھ ٹھیک ہوتا چلا گیا۔“ منصور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہاں کبھی کسی مسئلے سے دوچار نہیں ہوئے۔ صرف اس لئے کہ اللہ کی تائید ہمارے ساتھ تھی......... تو ان مسائل کا حل بھی نکل آئے گا۔ ہم خوشی کی بات پر پریشان کیوں ہوں۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ ہماری ہر ممکن احتیاط کے باوجود.........“

”میں اسی پر تو حیران ہوں۔“ رابعہ بولی۔

”حیران ہونا چھوڑ دو۔ یہ امر تو خود تائید الٰہی کی دلیل ہے۔ اس میں بھی بہتری ہوگی۔ ایک بہتری تو نظر آ رہی ہے۔ اب انشاء اللہ میری نسل چلے گی۔ مجھے یقین ہو گیا ہے۔ اور بہتری کے اور بھی پہلو ہوں گے، جو ہمیں نظر نہیں آ رہے ہیں۔“

”یہ تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو مگر پھر بھی میں سوچتی ہوں کہ کسی ڈاکٹر سے مل کر اس سلسلے میں کچھ کروں۔ یہ لوگ تو ویسے بھی آبادی میں اضافے کے خلاف زبردست مہم چلا

رہے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے' اسقاط........."

"ہاں منصور' میں نے دل پر پتھر رکھ کر یہ بات سوچی ہے۔"

"ایسی حماقت کرنا بھی نہیں۔ اول تو میرے نزدیک یہ بہت بڑا ناشکرا پن بھی ہے اور قتل بھی اور پھر تم یہاں یہ ظاہر کرتی رہی ہو کہ ہمیں اولاد کی بڑی آرزو ہے۔ یہ بات سامنے آئی تو خواہ مخواہ کے شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔"

اور یہ حقیقت تھی۔ پڑوس کی بے تکلف عورتیں اس سلسلے میں رابعہ سے پوچھتی رہتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر رابعہ ہمیشہ آہ بھر کر کہتی۔ "آرزو تو بہت ہے بہن۔ پر بھگوان کے سامنے کس کی چلتی ہے۔ بھگوان کی اِچھا ہوگی تو میری گود ضرور بھرے گی۔ میں تو بس پرارتھنا کر سکتی ہوں۔"

"پر اپنا اور اپنے پتی کا چیک اپ تو کرالو۔" کوئی پڑوسن کہتی۔

"کئی بار کرا چکے ہیں موسی۔" رابعہ جواب دیتی۔ "ہم دونوں میں کوئی خرابی نہیں۔"

"یہی تو بھگوان کی لیلا ہے۔ ورنہ کون مانے بھگوان کو۔"

"میں تو کہتی ہوں' منت مان لو کوئی۔"

"مانی ہوئی ہے۔ اولاد ہوئی تو رام مندر جا کر پوجا کروں گی۔ چڑھاوا دوں گی۔" رابعہ کہتی۔

رابعہ کو یہ تمام باتیں یاد آگئیں۔ منصور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ کرنا حماقت ہی ہوتی۔ "تو اب کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" منصور نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ تم نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری سنائی ہے۔"

اس روز وہ کام پر گیا تو بہت مطمئن تھا۔ تاہم وہ سوچ بھی رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہے۔

دن گزرتے رہے۔ وہ بار بار رابعہ کو احتیاط برتنے کی تلقین کرتا' یہ کرو وہ نہ کرو' وزن نہ اٹھاؤ۔ بھاری کام نہ کیا کرو۔ میرے لئے چھوڑ دیا کرو۔ رابعہ ہنستی' کہتی۔ "ابھی

ایسی کوئی بات نہیں۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہو۔"

ایک دن بیٹھے بٹھائے منصور کو اپنی خالہ کا خیال آگیا۔ وہ اس کی سگی خالہ تھیں اور اجمیر میں رہتی تھیں لیکن اس کے پاس ان کا پتہ نہیں تھا۔ بہرحال یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ انہیں تلاش کر سکتا تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔

دفتر میں لوگوں کو علم ہوا کہ وہ صاحبِ اولاد ہونے والا ہے تو سب بہت خوش ہوئے۔ اس نے خوب مبارک بادیں وصول کیں۔

ایک رات اس نے رابعہ سے اپنے منصوبے پر گفتگو کی۔ اسے سب کچھ سمجھا دیا لیکن وہ رابعہ کو اس پر مائل نہ کر سکا کہ وہ منصوبے میں آخر تک شامل نہ ہو۔ رابعہ اپنی شمولیت پر اڑی رہی۔ "دیکھو نا......... ہم بچ کر نکل بھی تو سکتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ ناممکن ہے رابو۔ اول تو بچ نکلنے کی صورت میں بھی ہم پکڑے جائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا' وہ میرے لئے تصور کی حد تک بھی ناقابل برداشت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں پکا کام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ عین موقع پر کوئی گڑبڑ ہو جائے اور معاملہ ٹھپ ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو اور میری آرزو ہے کہ میں وہاں نماز بھی ادا کروں۔"

"بس تو پھر میں تمہارے شانہ بشانہ رہوں گی۔" رابعہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"ٹھیک ہے رابو۔ یہ بتاؤ' سب کچھ سمجھ گئی ہو؟"

"سب سمجھ گئی ہوں۔ بس اس آخری مرحلے میں بہت شرم آئے گی۔"

"یہ سمجھ کر گزر جانا اس سے کہ اس کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے بس یہ فکر ہے کہ تم اتنا بوجھ اٹھا بھی سکو گی۔"

"بوجھ کی تم فکر نہ کرو۔ وہ تو الٹا نیچرل ٹچ بن جائے گا۔"

"ویسے میں کوشش کروں گا کہ بوجھ کم سے کم ہو۔"

☆======☆======☆

رابعہ کو آٹھواں مہینہ چل رہا تھا۔ ایک روز منصور رام پرشاد سے ملنے جا پہنچا۔ "کہو رمیش' کیسے ہو؟" رام پرشاد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کام تو بہت اچھا چل رہا ہے۔ تمہارے کام سے سب خوش ہیں۔"

"بھگوان کی کرپا ہے اور آپ کی دیا ہے مہاراج۔ آپ نے میری بڑی سہائتا کی ہے۔" منصور نے کہا۔

"ایسی باتیں نہ کرو۔ بھگوان داس جیسا مِتر تمہیں میرے پاس لایا تھا اور تم آدمی بھی کام کے نکلے۔ اور' خوش تو ہو؟"

"جی مہاراج!"

"اس وقت کیسے آئے؟ کوئی کام ہے؟"

"مہاراج ایک ہفتے کی چھٹی مانگنے آیا ہوں۔"

"چھٹی......... وہ کس لئے؟"

منصور کی نظریں جھک گئیں۔ "مہاراج میری پتنی امید سے ہے۔ یہاں ہم اکیلے ہیں۔ میں اپنی پتنی کو احمد آباد چھوڑ کے آنا چاہتا ہوں......... اس کی موسی کے گھر۔"

"اوہ......... تو یہ بات ہے۔ دھنیہ واد۔" رام پرشاد مسکرا دیا۔ "بھئی ضرور جاؤ۔ آج تک تو تم نے ایک دن کی چھٹی بھی نہیں کی۔"

"شکریہ مہاراج۔ میں بس اسے چھوڑتے ہی آ جاؤں گا۔ ایک ہفتہ بھی نہیں لگے گا۔"

"جلدی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہے۔ ایک ڈیڑھ ماہ بعد مجھے پھر چھٹی کی ضرورت پڑے گی۔"

"کیوں؟"

"آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ میری پتنی نے منت مانی تھی کہ بھگوان نے اس کی گود بھری تو وہ اجودھیا کے رام مندر میں پوجا کر کے چڑھاوا دے گی۔"

"اور تمہارے من کی مراد پوری ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے رمیش۔ تم اس کی پروا مت کرو۔ اس موقع پر بھی تمہیں چھٹی مل جائے گی۔"

رمیش مطمئن باہر نکل آیا۔

ادھر رابعہ پڑوس کی تمام عورتوں کو بتا چکی تھی کہ اس کی زچگی احمد آباد میں ہوگی۔ کسی کے لئے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

اسی شام منصور نے ضروری سامان ایک علیحدہ سوٹ کیس میں بڑی احتیاط کے ساتھ پیک کیا۔ وہ اس کے منصوبے کا سب سے خطرناک مرحلہ تھا۔ راستے میں اس سوٹ کیس کی تلاشی لے لی جاتی تو سب کچھ ختم ہو جاتا۔ ویسے درحقیقت اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن منصور بہرحال اس طرف سے پریشان تھا۔

رابعہ نے بھی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ وہ پڑوس کی تمام عورتوں کو بتا آئی تھی۔ صبح ان کی روانگی کے وقت محلے کے تمام لوگ جمع ہو گئے تھے۔ سب نے انہیں بڑی محبت سے آشیرباد دے کر رخصت کیا۔ وہ دونوں احمد آباد جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئے لیکن بھوپال پر وہ اتر گئے۔ وہاں سے انہوں نے رخ بدلا اور اجمیر کی ٹرین پکڑ لی۔

اجمیر پہنچتے ہی انہوں نے ایک ہوٹل کا رخ کیا۔ منصور کا خیال تھا کہ اب اسے نجمہ خالہ کی تلاش میں مارے مارے پھرنا ہوگا۔ اتنے بڑے شہر میں کسی کو تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بس ایک چانس تھا۔ اس کے خالو محمود احمد ایک متمول اور بارسوخ آدمی تھے۔ ان کے گھر ٹیلی فون کا ہونا کوئی انہونی نہیں تھا۔

اسی خیال کے زیر اثر اس نے نیچے جا کر استقبالیہ پر ٹیلی فون ڈائریکٹری طلب کی۔ اب یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ محمود نام کے کئی آدمیوں میں محمود احمد ایک سے زائد نہیں تھے۔ کئی محمود الحسن تھے اور کئی محمود کسی اور لاحقے کے ساتھ تھے۔ اس نے محمود احمد کا فون نمبر اور سامنے لکھا ہوا پتہ نوٹ کر لیا۔

رات انہوں نے ہوٹل میں ہی گزاری۔ صبح بہت سویرے وہ ادائیگی کر کے ہوٹل سے نکل آئے۔ سڑکوں پر چہل پہل شروع نہیں ہوئی تھی۔ منصور نے ایک تانگہ روکا اور اسے پتا بتایا۔ پندرہ منٹ میں وہ منزل پر پہنچ گئے۔ منصور کو اب بھی دھڑکا تھا کہ یہ کوئی اور محمود احمد نہ ہوں۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ جن خاتون نے کھولا' وہ نجمہ خالہ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی تھیں۔ منصور نے امی جان کی بے شمار تصویریں دیکھی تھیں اور نجمہ خالہ ہُوبہو امی جان جیسی تھیں۔ اس نے بہت آہستہ سے کہا۔ "خالہ' آپ مجھے نہیں پہچانیں لیکن میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ گرمجوشی کا مظاہرہ یہاں دروازے پر نہ کیجئے گا۔ میں ذرا سامان اتار کر تانگے والے کو رخصت کر دوں۔"

اس نے سامان اتار کر تانگے والے کو پیسے دیئے پھر سامان اٹھا کر رابعہ کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ خاتون سکتے کی سی کیفیت میں دروازے پر کھڑی تھیں۔

"خالہ......... میری نجمہ خالہ........." منصور نے بڑی محبت سے انہیں پکارا۔

خاتون کو جیسے اچانک ہی ہوش آیا پھر ان کی آنکھوں سے آنسو امنڈ پڑے۔

"خالہ پلیز' ہمیں راستہ دیں۔" منصور کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

خالہ ایک طرف ہٹ گئیں۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ خالہ نے دروازہ بند کیا۔

وہ دونوں گومگو کے عالم میں کھڑے تھے۔ خالہ منصور کے سامنے جا کھڑی ہوئیں اور اسے بہت غور سے دیکھتی رہیں۔ پھر انہوں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "کبھی تیری تصویر نہیں دیکھی لیکن پہچان گئی ہوں' تُو سلمیٰ باجی کا بیٹا ہے نا؟"

"ہاں خالہ۔ میں منصور ہوں۔"

خالہ نے اسے بھینچ کر سینے سے لگالیا۔ دیر تک وہ اس کا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھکائے اس کا چہرہ چومتی رہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ رابعہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑی تھی۔ منصور پر بھی رقت طاری ہو گئی تھی۔ خالہ کے لمس سے اسے ماتا کی وہ گرمی مل رہی تھی' جس کے لئے وہ ہمیشہ ترستا رہا تھا۔

پھر اچانک خالہ کو رابعہ کا خیال آ گیا۔ "ارے بہو بھی تو ہے ساتھ۔" انہوں نے منصور کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "ہٹ......... وہ بھی کیا کہے گی کہ بیٹے کو تو کلیجے میں بھر لیا اور بہو کو نظرانداز کر دیا۔" یہ کہہ کر انہوں نے رابعہ کو لپٹا لیا۔ "ارے میرے لاڈلے کی دلہن۔ میری سلمیٰ باجی تو تجھے دیکھ بھی نہیں سکی ہوں گی۔"

پندرہ بیس منٹ وہیں گزر گئے تب کہیں یہ ابال تھما۔ خالہ انہیں اندر لے گئیں۔

بیرونی دروازے کے ساتھ ہی بیٹھک تھی' جس کا ایک دروازہ اندر کھلتا تھا۔ باہر والا دروازہ داخلی دروازے کے ساتھ تھا۔

خالہ انہیں جس کمرے میں لے گئیں وہ بے حد کشادہ اور ہوادار تھا۔ فرشی نشست تھی۔ دیواروں سے گاؤ تکئے لگے تھے۔ "تُو یہاں سامان رکھ کر آرام سے بیٹھ' میں تیرے لئے دوسرا کمرہ ٹھیک کرتی ہوں لیکن نہیں......... پہلے ناشتہ تو نمٹا لوں۔"

"خالو جان کہاں ہیں؟" منصور نے پوچھا۔

"وہ نہا رہے ہیں۔ ابھی ناشتے پر ملاقات ہو جائے گی۔"

"اور........."

"بس' اب چپ رہ۔ تجھ سے باتیں کرنے کو تو عمر چاہئے۔ گھڑی دو گھڑی میں کام نہیں چلے گا۔ تم دونوں بھی ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔"

"ہم ہوٹل سے آ رہے ہیں خالہ۔ تیار ہو کر نکلے ہیں۔"

"بس تو بیٹھو۔ میں ابھی آئی۔"

پندرہ منٹ بعد خالہ دسترخوان لائیں اور بچھا دیا۔ وہ ناشتا لے کر آئیں تو ان کے ساتھ خالو محمود بھی تھے۔ ان کی شخصیت بہت بارعب تھی۔ سرخ و سپید رنگت' خوبصورت نقش' کھڑا قد۔ خالہ نے ان سے کہا۔ "یہ دیکھو' کون آیا ہے ہمارے ہاں۔ یہ منصور ہے......... سلمیٰ باجی کا بیٹا۔ پاکستان سے آ رہا ہے۔"

منصور ان کی پیشوائی کے لئے اٹھا۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "تم منظور میاں کے بیٹے ہو نا؟" انہوں نے اسے پیچھے ہٹا کر بہت غور سے دیکھا۔

"جی ہاں۔"

"تم نہ بھی بتاؤ تو پتہ چل جائے۔ ایسے گئے ہو اپنے باپ پر۔" خالو جان بولے۔ "تمہارا باپ بہت عظیم انسان تھا۔ اللہ اسے غریقِ رحمت کرے۔ آؤ' پہلے ناشتہ کر لو' پھر باتیں ہوں گی۔"

پھر باتیں ہوئیں......... اور خوب ہوئیں۔ برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں تو گھڑی کی سوئیوں کی گردش غیر اہم ہو جاتی ہے۔ جبکہ وہ تو وہ لوگ تھے جو ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے تھے۔

☆------☆------☆

خالو محمود حکیم تھے۔ پھولوں والے چوک پر مطب کرتے تھے۔ اللہ نے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ مطب پر مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ہمیشہ کے خوشحال تھے۔ اللہ نے بڑی رحمت کی تھی ان پر۔ مگر بہت دکھی تھے۔ تین بیٹوں' تین بیٹیوں کے ہوتے ہوئے تنہا تھے۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں اور اس شہر میں نہیں تھیں۔ بیٹے تینوں شہید ہو گئے تھے۔ وہ علی گڑھ میں تعلیم پا رہے تھے اور وہاں کے مسلم کش فسادات میں

شہید ہو گئے تھے۔ تیسرا میرٹھ کے فسادات میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ تین جوان بیٹوں کی موت نے خالہ اور خالو کی زندگی اندھیر کر دی تھی۔ اس پر بابری مسجد کا سانحہ! "اب تو ہمارے پاس اللہ کی نذر کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں بچا۔" خالو جان نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

خالو جان مطب پر چلے گئے تو منصور نے اپنا مسئلہ خالہ کے سامنے رکھا۔ پہلے تو خالہ کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا۔ پھر وہ ایکسائیٹڈ ہو گئیں۔ "کیسی باتیں کرتا ہے لڑکے۔ مندر کی حفاظت کا زبردست انتظام کیا گیا ہے۔ یہ خیال دل سے نکال دے بیٹے!"

"خالہ! میرا منصوبہ بڑا مکمل ہے۔ انشاء اللہ آپ اگلے ماہ یہ مبارک خبر سن لیں گی۔ سارے حفاظتی انتظامات دھرے رہ جائیں گے۔"

"لیکن بیٹا........"

"خالہ........ بس آپ میرا مسئلہ حل کر دیں۔ مجھے اپنے ہونے والے بچے کی فکر ہے۔ یہ بتائیں' آپ کا پاسپورٹ بنا ہوا ہے۔"

"بیٹا' جب میں پاکستان جانا چاہتی تھی تو یہاں کی مصروفیت نے گھیرے رکھا۔ ذرا فرصت ملی تو سلمیٰ باجی ہی دنیا میں نہیں رہی تھیں مگر خدا بڑا کارساز ہے۔ پچھلے سال یہاں کی تنہائی سے میرا دل گھبرا گیا تو میں نے تیرے خالو سے کہا' پاسپورٹ بنوا لو' میں کم از کم سلمیٰ باجی کے بچوں سے ہی مل آؤں جا کر۔ سو پاسپورٹ بن گیا۔"

"تب تو کام بن جائے گا خالہ۔ آپ خالو جان سے بات کریں۔ کریں گی نا؟"

"ضرور کروں گی لیکن اس معصوم کو کیوں دھکیلتا ہے؟" خالہ نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔

"خالہ........ میرے بغیر تو یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" رابعہ نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ میرے مقدر میں اللہ نے یہ سعادت لکھ دی ہے۔"

خالہ نے منصور کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ منصور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں خالہ' مجبوری ہے۔ ورنہ دل تو میرا بھی نہیں چاہتا تھا۔"

"ٹھیک ہے منصور۔ میں تیرے خالو سے بات کر لوں گی۔"

رات کو خالو جان خود منصور کے پاس آئے۔ "بیٹا۔ تمہاری خالہ سے سب کچھ

معلوم ہو گیا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "تم بہو کی جگہ مجھ سے کام لے لو نا۔ مجھے بڑی آرزو ہے کچھ کرنے کی۔ میرے بیٹوں کا لہو ہر وقت مجھے پکارتا رہتا ہے۔"

"یہ ممکن نہیں خالو جان۔ رابعہ کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ ورنہ میں کبھی ایسا نہیں کرتا۔" منصور نے کہا اور پھر انہیں تفصیل سے سب کچھ سمجھایا۔

خالو جان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "بیٹے........ خدا تمہیں سرخرو کرے۔ میں تمہارے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں۔ میں کل ہی ویزے کے لئے درخواست دے دوں گا۔"

"کچھ اندازہ ہے' کتنے دنوں میں مل جائے گا ویزا؟"

"انشاء اللہ زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ میری بڑی جان پہچان ہے۔ مریض تو ضرورت مند ہوتا ہے نا۔ کبھی نہیں بھولتا اپنے طبیب کو۔"

"بس تو خالو جان' یہ کام کر لیں آپ۔"

منصور نے چھ دن خالہ اور خالو کی محبت اور مہمان داری کے مزے لوٹے۔ وطن چھوڑنے کے بعد پہلی بار اسے گھر میسر آیا تھا۔ وہ بہت خوش رہا۔ جانے سے پہلے اس نے خالہ اور خالو سے تمام تفصیلات طے کر لیں۔ خالو جان ویزے کی درخواست پہلے ہی دے چکے تھے۔

اس نے پوری ایک ہفتے کی چھٹی سے استفادہ کیا تھا۔

☆======☆======☆

جبل پور میں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ بس رابعہ نہیں تھی اور یہ منصور کو بہت بڑا فرق معلوم ہو رہا تھا۔ ملنے کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ منصور سوچتا' رابعہ تو خالہ اور خالو کی محبت کے سائے میں ہے لیکن میں تو اکیلا ہوں........ بالکل اکیلا۔ پھر وہ سوچتا' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ رابعہ بھی تو میری کمی اسی طرح محسوس کر رہی ہوگی۔

پڑوس کے لوگوں نے آ کر اس سے رابعہ کی خیریت دریافت کی۔ چند ایک گھروں سے کھانے کی پیشکش بھی ہوئی لیکن منصور نے شکریئے کے ساتھ انکار کر دیا۔ خالی گھر اسے پھاڑ کھانے کو دوڑتا تھا۔ چنانچہ اس نے خود کو کام میں گم کر لیا۔ صرف دس دن میں اس نے ایک ہفتے کی چھٹیوں کی تلافی کر دی۔ وہ سائٹ پر جاتا۔ وہاں مصروف رہتا۔

سائٹ سے وہ دفتر واپس آتا اور دیر تک کام کرتا۔ رات کا کھانا ہوٹل سے کھاتے ہوئے وہ گھر واپس آتا تو تھکن سے چُور ہوتا۔ بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند آجاتی۔

مصروفیت میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ آخر کار اسے احمد آباد سے ٹیلی گرام موصول ہوگیا۔ خالو جان نے خاصی زحمت کی ہوگی۔ بہرحال کام پکا ہوا تھا۔ ٹیلی گرام میں صرف اتنا لکھا تھا کہ فوراً آجاؤ۔ ریکھا۔

اگلے روز وہ ٹیلی گرام لے کر رام پرشاد کے پاس چلا گیا اور ٹیلی گرام اس کے سامنے رکھ دیا۔ رام پرشاد نے ٹیلی گرام پڑھا اور مسکرا دیا۔ ”تو شبھ گھڑی آ پہنچی۔“

”جی مہاراج۔ شبھ گھڑی آ پہنچی‘ جس کا مجھے انتظار تھا۔“

”کتنی چھٹی چاہئے تمہیں؟“

”تین ہفتے کی۔“

”کل جاؤ گے؟“

”ابھی جانا چاہتا ہوں مہاراج!“

”ٹھیک ہے۔ چلے جاؤ۔“

”ایک کام اور کر دیں میرا۔“ منصور نے کہا۔ ”میری پتنی نے منت مانی تھی کہ اس کی گود ہری ہوئی تو رام مندر میں چڑھاوا دے گی اور پوجا کرے گی اور وہاں کا حال تو آپ جانتے ہی ہیں۔ مسلمان مندر کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ راستے ہی میں نہ روک لیا جاؤں۔ آپ مجھے کمپنی کی طرف سے لیٹر دے دیں کہ میں رمیش چوہان آپ کی کمپنی کا برسوں پرانا وفادار خادم ہوں۔“

”تم جاؤ۔ آدھے گھنٹے میں لیٹر تمہیں مل جائے گا۔“

لیٹر ملتے ہی منصور اجمیر کے لئے روانہ ہوگیا۔ ۳ مئی ۹۷ء کی صبح ساڑھے تین بجے وہ نجمہ خالہ کے ہاں پہنچا۔ رابعہ کی حالت بہت خراب تھی۔ خالہ نے ایک معتبر دائی کو بلوا لیا تھا۔ منصور کی صورت دیکھتے ہی رابعہ کرب کے باوجود مسکرائی۔ منصور کو وہ دنیا کی حسین ترین مسکراہٹ لگی۔

رابعہ شاید منصور کی ہی آمد کی منتظر تھی۔ اس کی آمد کے ٹھیک دو گھنٹے بعد اس نے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ منصور کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ خالہ اور خالو جان بھی بہت

خوش تھے۔ انہوں نے دائی کو بھی خوش کر دیا۔

منصور نے بچوں کے کانوں میں اذان دی۔ ”میرے بچو۔ یہ میں تمہارا پہلا اور آخری کام کر رہا ہوں۔“ اس نے بوجھل سرگوشی میں کہا۔

نجمہ خالہ رابعہ کی نگہداشت میں مصروف تھیں۔ خالو جان نے بتایا کہ انہیں ویزا مل گیا ہے جو ۲۷ اپریل سے تین ماہ کی مدت کے لئے ہے۔ منصور نے فوراً بکنگ کرانے کا مشورہ دیا۔

”لیکن بیٹا‘ اتنی جلدی کیا ہے۔ بہو کو ذرا آرام مل جائے۔“

”خالو جان‘ یہ معاملہ جتنی جلدی نمٹ جائے اچھا ہے۔ پھر ریزرویشن بھی اتنی آسانی سے تو نہیں ملے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کل دہلی چلا جاؤں گا۔ فلائٹ تو دہلی سے ہی ملے گی ہمیں۔“ خالو جان اگلی صبح دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ انہیں اگلے روز واپس آنا تھا۔

بچوں کی پیدائش کے بعد منصور پہلی بار رابعہ کے پاس گیا تو رابعہ کا چہرہ زرد ہو رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی اور وہ بہت پاکیزہ...... بہت حسین لگ رہی تھی۔ ”مبارک ہو۔“ منصور نے بیڈ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

رابعہ نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ ”تمہیں بھی مبارک ہو پریتم۔ اللہ کا شکر ہے اور تمہارا شکریہ‘ آج میں مکمل ہو گئی۔ میرے خواب کی تعبیر مل گئی۔“

”اور کمال یہ ہے کہ خواب ایک تھا‘ تعبیریں دو ہیں۔“ منصور نے شوخ لہجے میں کہا۔ ”رابو‘ تم نے تو کمال کر دیا۔“

رابعہ شرما گئی۔ ”کوئی نام بھی سوچا تم نے؟“

”بات گول کر گئیں نا۔ چالاک کہیں کی۔“ منصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیوں نہیں کہتیں کہ ایک تعبیر تمہاری ہے اور دوسری میری۔“

”نہیں۔ دونوں میرے بھی ہیں اور تمہارے بھی۔“

”لیکن ایک کا نام تو تم رکھو گی اور دوسرے کا میں۔ اب یہ طے کر لو کہ کون کس کا ہے۔“

رابعہ نے پہلو میں لیٹے ہوئے دونوں بچوں کو دیکھا۔ ایک کے بال سیاہ اور موٹے

تھے........ منصور کی طرح اور دوسرے کے بال بھورے اور ریشم جیسے ملائم تھے........ رابعہ کے بالوں کی طرح۔ "یہ فیصلہ تو تمہیں کرنا ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"یہ بھورے بالوں والا میرا ہے۔ یہ تم جیسا نکلے گا۔"

"بالکل ٹھیک۔ یہ سیاہ بالوں والا میرا ہے۔ یہ بالکل تم جیسا ہے۔"

"کوئی نام بھی تھا تمہارے ذہن میں؟" منصور نے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن پہلے تم بتاؤ۔"

"نہیں۔ پہلے تم۔ تم بس اس سیاہ بالوں والے کا نام بتا دو۔ بھورے والے کا نام میں نے سوچ لیا ہے۔"

"بہت ضدی ہو۔ چلو........ میں پہلے بتا دیتی ہوں۔ یہ جو تم جیسا ہے نا' اس کا نام میں نے سرمد رکھا ہے........ سرمد صدیقی۔" وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

"سبحان اللہ!" منصور نے بے ساختہ کہا۔

"واقعی اچھا لگا تمہیں؟"

"سچ........ بہت ہی اچھا نام ہے۔ تم نے تو نام رکھنے میں بھی کمال کر دیا۔"

"بس بناؤ نہیں زیادہ۔ اب تم بتاؤ۔"

"میں دوسرے بیٹے کا نام عبداللہ رکھ رہا ہوں۔"

"بہت خوب! اللہ مبارک کرے۔"

"اب میں تم سے ایک اہم بات پوچھ رہا ہوں۔ تم اتنے سخت مرحلے سے گزری ہو۔ وہ بوجھ اٹھا سکو گی' جو اٹھانا ہے۔ ہم اپنے پروگرام کو بھی مؤخر نہیں کر سکتے۔"

"ہرگز نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے اس بوجھ سے تکلیف ہوگی۔ یوں میرے چہرے کا کرب سچا ہوگا۔ کوئی شک بھی نہیں کرے گا۔"

"لیکن رابعہ........"

"منصور........ ہم ایک ایسی زندگی کے راستے پر جا رہے ہیں' جس پر انسان کبھی نہیں مرتا۔ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔" رابعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔

اگلے روز خالو جان دہلی سے واپس آ گئے۔ انہیں سترہ مئی کی ریزرویشن ملی تھی۔

وہ عرصہ انہوں نے بہت ہنسی خوشی گزارا۔ دونوں بچوں میں گم رہے۔ خالو جان نے فیض آباد کے لئے کوپے کی بکنگ کرا دی تھی تاکہ رابعہ کو بے آرامی نہ ہو۔ فیض آباد سے اجودھیا تک انہیں بس میں سفر کرنا تھا۔ کوپے کی بکنگ سترہ تاریخ کی تھی۔ ٹرین کو صبح چار بجے روانہ ہونا تھا۔ خالو جان کی فلائٹ صبح چھ بجے کی تھی۔ طے پایا تھا کہ وہ سولہ کی رات دہلی کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔

خوشی کے وہ دن پلک جھپکتے بیت گئے۔ سولہ کا دن آ پہنچا........ جدائی کا دن۔ منصور کچھ دیر کے لئے کمرے میں بند ہو گیا۔ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کیسٹ تھا۔ کیسٹ اس نے خالو جان کی طرف بڑھایا۔ "خالو جان' اس میں میرا پیغام ہے........ قوم کے نام۔ کوشش کیجئے گا کہ اسے کسی اتھارٹی تک پہنچا دیں۔"

محمود صاحب نے کیسٹ لے لیا۔ "لیکن بیٹا' یہ مشکل کام ہے۔ اول تو وہ کیسٹ لے جانے نہیں دیں گے۔ لے جانے دیا تو پہلے خود سنیں گے۔"

خالہ نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ لے لیا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کا بندوبست کر لوں گی۔"

سورج ڈوب گیا۔ جدائی کی گھڑی آ پہنچی۔ خالہ اور خالو گھر کے در و دیوار کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتے کہ اب وہ یہاں کبھی نہیں آ سکیں گے۔ سب اداس تھے۔ منصور اور رابعہ بار بار بچوں کو پیار کر رہے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر خالہ اور خالو کا دل کٹا جا رہا تھا۔

بالآخر خالہ اور خالو کی روانگی کا وقت آ گیا۔ "میں نے تانگے والے سے کہہ دیا ہے' وہ تین بجے تمہیں لینے آ جائے گا۔" خالو جان نے منصور سے کہا۔

"جاتے وقت گھر کو تالا لگا دینا۔" خالہ نے کہا۔

"وہاں سب کو میرا اور رابعہ کا سلام کہئے گا۔" منصور نے کہا۔

ایک دوسرے سے گلے لگتے ہوئے کوئی بھی اپنے آنسو روک نہ سکا۔ بالآخر جانے والے چلے گئے۔ بچوں کے جانے سے گھر میں سناٹا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے ایک دوسرے کے آنسو پونچھے اور ضروری کاموں میں مصروف ہو گئے۔ وہ ان کے آخری آنسو تھے۔

☆======☆======☆

تین بجنے میں دس منٹ پر تانگے والے نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک خوش رُو جوان آدمی نے کھولا۔ اس کی عمر ۳۵ کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے چہرے پر مونچھیں کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ تانگے والے نے سوچا' اس کے چہرے پر مونچھیں نہ ہوتیں تو یقیناً یہ بہت خوبرو آدمی ہوتا۔

"حکیم صاحب نے حکم دیا تھا کہ آپ کو اسٹیشن پہنچانا ہے۔" تانگے والے نے کہا۔

"ایک منٹ۔ میں ابھی آیا۔"

جوان آدمی باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ ایک حاملہ جوان عورت کو سہارا دیئے ہوئے تھا۔ اس نے سوٹ کیس تانگے کے اگلے حصے میں رکھا اور عورت کو سہارا دے کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا۔ پھر وہ خود بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔ "چلو بابا۔" اس نے کہا۔

☆======☆======☆

ٹرین کا سفر ناخوشگوار ہرگز نہیں تھا۔ خالو جان نے کوپے بک کرا کے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ رابعہ واقعی بڑی زحمت سے بچ گئی تھی۔ سفر کے دوران کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ بالآخر وہ فیض آباد پہنچ گئے۔ فیض آباد سے انہیں بس لینا تھی۔ وہاں بہت رش تھا۔ یاتریوں کا بڑا ہجوم تھا۔ وہاں بھی رابعہ کا حاملہ ہونا کام آیا۔ لوگ اس کے جذبے سے بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ ایک عورت جو اس حال میں منت پوری کرنے جا رہی تھی' ان کے لئے تو وہ ایک دیوی سمان تھی۔

انہیں بس میں جگہ مل گئی۔ ذرا دیر بعد وہ اجودھیا کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں پہلی بار انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ایک جگہ بس روکی گئی اور مسلح فوجی بس پر چڑھ آئے۔ وہ بے حد الرٹ نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے مسافروں کے سامان کی تلاشی لی۔ بعض مسافروں کی جامہ تلاشی بھی لی گئی۔ وہاں منصور کا کمپنی کا لیٹر کام آیا۔ رابعہ اٹھنے لگی تو فوجی نے کہا۔ "آپ بیٹھی رہو بہن۔"

☆======☆======☆

وہ سترہ تاریخ کی صبح تھی۔ وزیراعظم پاکستان نے اس روز پروٹوکول اور ہر احتیاط کو

بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ انہوں نے اسلام آباد سے کراچی کے لئے عام پرواز سے سفر کیا تھا۔ سفر کے دوران وہ ساتھی مسافروں کو آٹوگراف دیتے اور ان سے خوش خلقی سے باتیں کرتے رہے تھے۔

طیارے نے لینڈ کیا۔ وزیراعظم نے وی آئی پی لاؤنج میں جانے سے انکار کر دیا۔ وہ عام پسنجر لاؤنج کی طرف چل دیئے۔ ان کے ساتھ صرف ان کا ایڈی تھا۔ وہاں وہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عام مسافروں کے مسائل کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

لاؤنج میں مسافروں کا ہجوم تھا۔ دہلی سے آنے والی فلائٹ کے مسافر امیگریشن کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ وزیراعظم بھی ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کا ایڈی پریشان اور متوحش دکھائی دے رہا تھا۔ وزیراعظم اس وقت ہمہ تن سماعت تھے۔

"میں اس ملک کی کسی اتھارٹی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس زوردار اور باوقار لہجے نے وزیراعظم کو چونکا دیا۔ انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ ایک دراز قد' خوبرو اور معمر آدمی امیگریشن کاؤنٹر پر ایک آفیسر سے مخاطب تھا۔

"دیکھئے......... یہ بے قاعدگی ہے۔ یہ بچے اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے۔" امیگریشن آفیسر کہہ رہا تھا۔ "ان بچوں کا پاسپورٹ میں اندراج نہیں۔ پھر آپ خود کہتے ہیں کہ یہ آپ کے بچے نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہاں والوں نے ان بچوں کو جہاز پر سوار کیوں ہونے دیا۔"

"انہیں میں نے مطمئن کر دیا تھا۔ آپ کو میں بتا رہا ہوں کہ یہ بچے آپ کے ملک اور قوم کی امانت ہیں۔" معمر آدمی نے کہا۔ "یہ ان ماں باپ کی اولاد ہیں' جو کچھ دیر بعد ایک بڑے مقصد کی راہ میں شہید ہونے والے ہیں۔"

"دیکھئے قبلہ......... میں ایسی کہانیاں روز سنتا رہتا ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ میں آپ کو واپس بھجوا رہا ہوں۔"

"اور میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ یہ قومی اہمیت کا معاملہ ہے۔" معمر آدمی نے زور دے کر کہا۔ "میرے پاس ملک کے سربراہ اور پوری قوم کے لئے ایک بے حد اہم پیغام ہے۔"

"آپ وہ پیغام مجھے دے دیں۔ میں فیصلہ کروں گا کہ........."

اس بار معمر شخص کی آواز بلند ہو گئی۔ "یہ معاملہ تمہارے لیول کا نہیں۔ اسی لئے کہہ رہا ہوں کسی اتھارٹی سے بات کراؤ۔ میرے پاس جو امانت ہے' وہ پوری قوم کی ہے اور بہت حساس نوعیت کی ہے۔"

"سوری' میں آپ کو ڈی پورٹ کر رہا ہوں۔"

وزیراعظم نے ایڈی کو اشارہ کیا۔ ایڈی کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ اس نے امیگریشن آفیسر سے کچھ کہا۔ آفیسر نے سر گھما کر اس طرف دیکھا۔ وزیراعظم کو دیکھ کر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ معمر شخص کو لے کر وزیراعظم کی طرف بڑھا۔ "سر! میں........" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ تم اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ اب تم جاؤ اور ان لوگوں کو کلیئر کر دو۔"

امیگریشن آفیسر بغیر کچھ کہے کاؤنٹر کی طرف چل دیا۔ وزیراعظم معمر شخص کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "آپ کا اسم گرامی؟"

محمود صاحب نے بھی وزیراعظم کو پہچان لیا تھا اور اس حسن اتفاق پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔ چند لمحے پہلے انہیں احساس ہو رہا تھا کہ سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا اور انہیں بچوں سمیت ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔ "خاکسار کو محمود احمد کہتے ہیں یور ایکسی لینسی۔"

"محمود صاحب' میں نے آپ کی گفتگو سنی۔ کچھ وضاحت کریں گے آپ!"

"یور ایکسی لینسی' معاملہ بہت حساس نوعیت کا ہے اور سخت رازداری کا متقاضی ہے۔"

وزیراعظم چند لمحے سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا۔ "کوئی اشارہ دے سکتے ہیں آپ؟"

"معاملہ بابری مسجد سے متعلق ہے۔" محمود صاحب نے سرگوشی میں کہا۔

وزیراعظم نے چند لمحے غور کیا۔ "آپ میرے ساتھ چلیں گے۔ پھر ہم رازداری سے گفتگو کر سکیں گے۔" کوئی انجانی حس انہیں بتا رہی تھی کہ معاملہ واقعی اہم ہے۔

☆======☆======☆

رام مندر کی پُرشکوہ اور عظیم الشان عمارت فوج کے گھیرے میں تھی۔ پوجا کے خواہش مند ہندوؤں کا جم غفیر تھا۔ مندر کے اردگرد خاردار تاروں کی باڑھ لگا دی گئی تھی۔ حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ اندر جانے کے لئے اجازت نامے جاری کئے جا رہے تھے۔ باڑھ کی چاردیواری کے باہر سامنے کی طرف عارضی نوعیت کا ایک دفتر بنایا گیا تھا۔ اجازت نامے وہیں سے جاری ہو رہے تھے۔ اجازت نامے کے خواہاں لوگوں کی قطار بہت طویل تھی........ اتنی طویل کہ گھنٹوں بعد نمبر آتا۔

منصور ایک فوجی کی طرف بڑھ گیا۔ رابعہ کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ چہرے پر حقیقی کرب تھا۔ جڑواں بچوں کی زچگی کے بعد تو عورت کے لئے چلنا بھی محال ہوتا ہے جبکہ وہ تو بہت بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے تھی۔

منصور بڑی مشکل سے فوجی کو رابعہ تک لے آیا۔ "یہ میری پتنی ہے شریمان جی۔ اس نے پوجا کی منت مانی تھی' اولاد کے لئے۔ ہمیں ایمرجنسی میں اجازت نامہ دلا دیجئے۔"

فوجی نے رابعہ کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا لیکن وہ بولا تو اس کا لہجہ خشک تھا۔ "اس حالت میں پوجا کی کیا ضرورت ہے؟"

وہاں کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ "چاہے پران چلے جائیں' بھگوان سے کیا ہوا وچن تو نبھاؤں گی۔"

ایک بوڑھی عورت نے رابعہ سے کہا۔ "پر پتری' تیرا سمے تو قریب لگتا ہے۔"

"ماتا........ میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ میرا بچہ اس پوتر دھرتی پر........ بلکہ مندر میں آنکھ کھولے۔"

"دھنیہ ہو بیٹی۔" عورت بولی۔

"جے بھگوان کی۔ جے رام جی کی۔" کسی نے نعرہ لگایا۔

"دیکھو........ ایسے ہوتے ہیں بھگوان کے بھگت۔" کوئی اور بولا۔

فوجی نے یہ رنگ دیکھا تو منصور سے کہا۔ "آؤ مہاشے میرے ساتھ۔ میں کچھ کرتا ہوں تمہارے لئے۔"

وہ منصور کو دفتر میں لے گیا اور اندر بیٹھے فوجی کو تفصیل بتائی۔ "ان کے لئے اجازت نامہ بنا دو کل کا۔"

"تمہارا نام؟"

"رمیش چوہان۔" رمیش نے کمپنی کا لیٹر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"پتنی کا نام؟"

"ریکھا۔"

وہ چند منٹ میں اجازت نامہ لے کر آیا۔ وہ خوش تھا کہ رابعہ کو آرام کے لئے مہلت مل گئی ہے۔ حفاظتی انتظامات کے پیشِ نظر مندر کے اوقات مقرر کر دیئے گئے تھے......... صبح سات بجے سے شام سات بجے تک۔ سات بجے کے بعد مندر کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔

منصور رابعہ کو ایک طرف بٹھا کر ہوٹل کی تلاش میں نکلا۔ عام ہوٹلوں میں کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ بلکہ باہر چارپائیاں تک ڈال دی گئی تھیں۔ بڑی مشکل سے ایک بڑے اور مہنگے ہوٹل میں منصور کو کمرا مل گیا۔ منصور کو اس وقت مہنگے سستے سے غرض نہیں تھی۔ وہ جا کر رابعہ کو ہوٹل کے کمرے میں لے آیا۔ کمرے میں رابعہ نے بوجھ سے نجات حاصل کی اور آرام کرنے لیٹ گئی۔

وہ رات ان کے لئے عبادت کی رات تھی۔ وہ ایک پل کے لئے بھی نہیں سوئے۔ نوافل ادا کرتے اور خدا سے مدد طلب کرتے رہے۔

☆======☆======☆

محمود صاحب بولتے رہے تھے۔ وزیراعظم نے انہیں ایک بار بھی نہیں ٹوکا لیکن ان کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ نجمہ بیگم دونوں بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھیں۔

"تو یور ایکسی لینسی' یہ دونوں بچے اس شخص کے......... بلکہ پوری قوم کی امانت ہیں۔" محمود صاحب نے دلگیر لہجے میں کہا۔

"یقین نہیں آتا۔" وزیراعظم نے کہا۔ "بہرحال تصدیق ہو جائے گی۔ آپ مجھے منصور صدیقی کا پتا' اس کے رشتے داروں کے پتے اور دیگر تفصیلات دے دیں۔"

"ضرور یور ایکسی لینسی!" محمود صاحب نے تمام تفصیلات ان کے گوش گزار دیں۔ پھر انہوں نے وزیراعظم کی طرف منصور کا کیسٹ بڑھایا۔ "یہ آپ کی اور قوم کی ایک

امانت ہے میرے پاس۔ اب میں بری الذمہ ہو رہا ہوں۔"

کیسٹ پلیئر میز پر ہی رکھا تھا۔ وزیراعظم نے کیسٹ خود اس میں لگایا' ری وائنڈ کیا اور پھر آن کر دیا۔ چند لمحے سرسر سی سنائی دی پھر ایک خوبصورت آواز ابھری۔ وزیراعظم بہت غور سے سن رہے تھے۔ محمود صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"السلام علیکم۔ میں منصور صدیقی ولد منظور صدیقی اپنی قوم کے قائدین سے' اپنے بزرگوں' بھائیوں' نوجوانوں' بچوں سے' اپنی ماؤں اور بہنوں سے مخاطب ہوں۔ جس وقت آپ میری آواز سن رہے ہوں گے' میں پاکستان کی دینی اور ملی حمیت کی پیشانی پر لگے بدنما داغ کو دھونے کی کوشش کر رہا ہوں گا۔ میں آپ سب کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ میرے حق میں دعا کیجئے گا۔

"٦ دسمبر ۹۲ء کا دن میں کبھی نہیں بھولا۔ ہم میں سے کوئی بھی نہیں بھول سکتا لیکن مجھے افسوس ہے کہ اس سانحے پر ہمارا ردِعمل ایک زندہ اور عاقل و بالغ قوم کے شایانِ شان نہیں تھا۔ پاکستانی ہندوؤں کو نقصان پہنچانا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے منافی تھا۔ بابری مسجد کے انہدام کی خبر سن کر میرے سینے میں بھی وہی آگ بھڑکی تھی جو آپ سب کے سینوں میں بھڑکی تھی لیکن میں نے اس آگ کو باہر نہیں نکالا۔ میں نے اسے آنکھوں کی حدود سے باہر نہیں آنے دیا۔ ایجی ٹیشن میرے نزدیک بے سود تھا کیونکہ ہمارا واسطہ جن لوگوں سے تھا انہوں نے مسلمانوں کی تو کیا' عالمی رائے عامہ کی بھی کبھی پروا نہیں کی۔ انہوں نے تو اس معاملے میں عدلیہ کے فیصلے کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔ میں چند ٹائر دو ایک گاڑیاں اور چند گھر جلا کر اپنے سینے کی آگ کو خاکستر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے نزدیک یہ قومی بچپنا تھا' میرے نزدیک اس سلسلے میں حکومت پر بھی ذمے داری ڈالنا زیادتی تھی۔ اس بیسویں صدی میں جنگیں بڑی ہولناک ہوتی ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں بچتا' اور پھر جنگ کا حاصل بھی کیا تھا۔ معاملہ تو وہیں کا وہیں رہتا اور میرا نظریہ یہ ہے کہ جہاں حکومتیں بے بس ہوں' وہاں افراد کو سوچنا پڑتا ہے۔ سو میں نے فرد بن کر سوچا اور اپنے فرض کا تعین کیا۔ میں نے اپنے سینے میں بھڑکنے والی آگ کو ایک مقدس راز کی طرح اپنے سینے میں رکھا۔ اسے خوب دہکایا۔ الاؤ بنا دیا اور اب انشاءاللہ وہ آگ بابری مسجد کے ملبے پر تعمیر ہونے والے رام مندر کو جلا کر بھسم کر دے گی۔ یہاں یہ وضاحت کر

دوں کہ مجھے کسی مندر سے کوئی دشمنی نہیں۔ میرا ہدف صرف رام مندر ہے' جو غاصبوں نے مسلمانوں کا حق چھین کر' ایک مسجد کی جگہ غصب کر کے تعمیر کیا ہے.........."

وزیراعظم بہت توجہ سے سن رہے تھے۔ محمود صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کیسٹ انہوں نے بھی پہلے نہیں سنا تھا۔

اب منصور اپنے منصوبے کی تفصیلات بیان کر رہا تھا۔ وہ رابعہ کا' اس کے کردار کا' اس کے ایثار و وفا کا' فرض شناسی کا تذکرہ کر کے اسے خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔ وہ اسلامی معاشرے میں ماں کے کردار اور اولاد کی تربیت کی اہمیت اجاگر کر رہا تھا۔ منصوبے کی تفصیلات سن کر وزیراعظم کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔

کمرے میں منصور کی آواز گونج رہی تھی۔

"تو میرے بزرگو' دوستو' میری ماؤ بہنو! مجھے امید ہے کہ اللہ کی تائید کے زور پر میں اور رابعہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ ہمارا آخری پیغام یہ ہے کہ اب قومی سطح پر بچپنا چھوڑیں اور بلوغت کی طرف قدم بڑھائیں۔ دینی اور ملی حمیت کو جب بھی کسی چیلنج کا سامنا ہو تو سینوں کی آگ کو منفی ردِعمل کے پانی سے نہ بجھائیں۔ سینوں کو روشن رکھیں۔ اندر الاؤ دہکاتے رہیں۔ یہاں تک کہ چیلنج کرنے والے کو بھسم کر دیں۔ شخصیت پرستی سے باز رہیں کہ اللہ نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم ازل سے ابد تک کائنات کے واحد کامل انسان ہیں۔ ان کی سیرتِ طیبہ کو دیکھنے کے بعد کم از کم مسلمانوں کے لئے تو شخصیت پرستی کی گنجائش ہی نہیں۔ ہم اس یقین کے ساتھ جان دے رہے ہیں کہ بابری مسجد کی جگہ رام مندر اگر ہزار بار تعمیر کیا جائے گا تو ہم ہزار بار اسے تباہ کر دیں گے' اور اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھنے والے اکیسویں صدی سے پہلے ہی خود اپنے ہاتھوں اس کے ٹکڑے کرتے نظر آئیں گے۔

"اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ التجا ہے کہ اگر کسی کا میری یا رابعہ کی طرف کوئی حساب نکلتا ہو تو خدا کو گواہ بنا کر اسے معاف کر دیا جائے۔ اللہ پاکستان اور پاکستانی قوم کو ہمیشہ اپنی امان میں رکھے اور بلندیوں اور کامرانیوں سے سرفراز فرمائے۔ خدا حافظ۔ فی امان اللہ!"

کیسٹ اب خالی چل رہا تھا لیکن وزیراعظم ایسی کیفیت میں تھے کہ انہیں کیسٹ

پلیئر آف کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ محمود صاحب کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ کیسٹ ختم ہوا تو پلیئر خودبخود آف ہو گیا۔ اس کی آواز سن کر وزیراعظم جیسے ٹرانس سے باہر آ گئے۔

"مرحبا!" انہوں نے بے ساختہ کہا۔ "جس قوم میں ایسے لوگ پیدا ہوں' وہ کبھی سرنگوں نہیں ہو سکتی۔"

محمود صاحب خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے پوچھا۔

"ہمارے لئے کیا حکم ہے یور ایکسی لینسی؟"

"یہ معاملہ واقعی حساس نوعیت کا ہے۔ ہم انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ اس وقت تک ہمارے مہمان رہیں گے' آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ صورتِ حال واضح ہونے کے بعد آپ جہاں کہیں گے' آپ کو پورے عزت و اکرام سے وہاں پہنچا دیا جائے گا۔"

"جی بہت بہتر۔"

"اور ہاں۔ اب آپ بھارت واپس نہیں جا سکتے۔ آپ کو یہاں کی قومیت دے دی جائے گی۔ آپ اپنے بارے میں تفصیل سے بتائیں مجھے۔"

اور اس باپ کی کہانی سن کر' جس کے تینوں جوان بیٹے ہندوؤں کے جنون کی بھینٹ چڑھ گئے تھے' وزیراعظم کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

☆======☆======☆

زندگی کی آخری رات ۱۹۹۷ء

منصور کھانے کا کچھ سامان رات ہی کمرے میں لے آیا تھا۔ انہوں نے آخری رات عبادت کی۔ صبح صادق سے پہلے انہوں نے سحری اور نفلی روزے کی نیت کر لی۔ فجر کی نماز پڑھ کر وہ نیچے آئے۔ کاؤنٹر پر ادائیگی کے بعد وہ باہر نکلے۔ انہوں نے ہار پھول لئے اور رام مندر کی طرف چل دیئے۔

بہت صبح کا وقت تھا۔ وہاں زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ وہ بڑی آسانی سے مندر میں داخل ہو گئے۔ مندر کا نقشہ منصور کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس نے چھپنے کے لئے جو تہہ خانہ منتخب کیا تھا' اس کا محلِ وقوع اور میکنزم اسے ازبر تھا۔

وہ ایک بہت بڑا.......... بے حد وسیع و عریض ہال تھا۔ چاروں طرف کی دیواروں پر

دیوی دیوتاؤں کی شبیہیں نقش تھیں۔ بالکل سامنے رام جی کا ایک بہت بڑا مجسمہ ایستادہ تھا۔ لوگ وہاں چڑھاوے دے رہے تھے۔ منصور اور رابعہ اس طرف جانے کے بجائے دروازے سے داخل ہوتے ہی داہنی سمت چل دیئے۔ ان کا انداز ایسا ہی تھا' جیسے شبیہوں کو دیکھ اور سراہ رہے ہوں۔ بڑھتے بڑھتے وہ کونے تک پہنچ گئے' جہاں دو دیواریں مل رہی تھیں۔

وہاں پہنچ کر منصور رک گیا۔ "بس' یہیں ٹھہر جاؤ رابو۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "اور یہ ظاہر کرتی رہو کہ شبیہیں دیکھ رہی ہو۔" وہ خود دونوں دیواروں کے نکتۂ اتصال کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اسے وہ مورتی نظر آگئی جس پر دباؤ ڈالنے سے تہہ خانے کا دروازہ کھلتا تھا۔ اس نے پلٹ کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ قریب کوئی نہیں تھا اور ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا لیکن منصور کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ تہہ خانے کا دروازہ کھلنے کی گڑگڑاہٹ کی آواز کتنی بلند ہوگی اور وہ اس آخری مرحلے میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

"رابعہ......... میں موقع ملتے ہی اس مورتی پر دباؤ ڈالوں گا۔ تہہ خانے کا دروازہ کھلتے ہی تم تیزی سے نیچے اتر جانا۔ بس الرٹ رہو۔" اس نے سرگوشی میں رابعہ سے کہا۔

وہ دونوں اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے۔ منصور بڑی احتیاط سے وقتاً فوقتاً گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا تھا۔

اچانک ہی مندر کے پجاری نے بھجن شروع کر دیا۔ آواز کی گونج ایسی تھی کہ در و دیوار سے' چھت سے' فرش سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ منصور نے پلٹ کر دیکھا اور پھر رابعہ سے پوچھا۔ "تیار ہو رابو؟" رابعہ کے اثبات میں سرہلاتے ہی اس نے بسم اللہ پڑھ کر مورتی پر دباؤ ڈالا۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اس کی یادداشت میکنزم کے معاملے میں دھوکا نہ دے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

گڑگڑاہٹ کی وہ آواز کم از کم انہیں تو بہت تیز لگی تھی۔ منصور نے گھبرا کر قربان گاہ کی طرف دیکھا لیکن بھجن کی آواز نے گڑگڑاہٹ کو دبا لیا تھا' اب پوجا کے لئے آئے ہوئے لوگ بھی پجاری کی آواز میں آواز ملا کر بھجن گا رہے تھے۔

فرش کا ایک حصہ ہٹا اور نیچے سیڑھیاں نظر آئیں۔ رابعہ تیزی سے اس میں اتر گئی۔ منصور پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ بھجن گانے والے جھوم جھوم کر زور و شور سے بھجن گانے میں مصروف تھے۔ منصور پلٹا اور تیزی سے خلا میں اتر گیا۔ چار سیڑھیاں اترنے کے بعد اسے ویسی ہی ایک مورتی نظر آئی۔ اس نے اس پر دباؤ ڈالا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز پھر بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی فرش کا وہ حصہ برابر ہوگیا۔

ان دونوں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سکون کی سانس لی۔ ایک اور مشکل......... بے حد مشکل مرحلہ خدا کے فضل و کرم سے سر ہوگیا تھا۔ اللہ کی تائید ان کے ساتھ تھی۔ وہ جدید طرز کا تہہ خانہ تھا اور کچھ اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ وہاں گھٹن بالکل نہیں تھی۔ اندھیرا البتہ تھا لیکن ذرا دیر گزرنے کے بعد ان کی آنکھیں اس تاریکی سے ہم آہنگ ہو گئیں۔ رابعہ نے سب سے پہلے بوجھ سے آزادی حاصل کی۔ منصور سامان کو ترتیب سے رکھنے میں مصروف ہوگیا۔ "تم ذرا دیر آرام کرلو۔ یہ سخت فرش بھی نعمت ہے ایسے میں تو۔" اس نے رابعہ سے کہا۔

رابعہ لیٹ کر سانسیں درست کرنے لگی۔ منصور کو اب اندازہ ہو رہا تھا کہ سامان کم ہرگز نہیں' ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے اور یہ بھی اچھا ہی تھا۔

پچھلے پورے دن انہوں نے پانی بالکل ہی نہیں پیا تھا ورنہ وضو کے لئے مسئلہ پیدا ہو جاتا اور اب تو وہ روزے سے تھا۔

بیکاری کا وہ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ وہ کبھی نفلیں پڑھتے اور کبھی آرام کے لئے لیٹ جاتے۔ نماز پڑھتے وقت ان کی خوشی کا اندازہ کون لگا سکتا تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بابری مسجد میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ خوشی انہیں اس بات کی تھی کہ انہوں نے ابتدا ہی میں ہندوؤں کو عبرت ناک شکست دی تھی۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ اس بت کدے میں نماز ادا کی جا رہی ہے۔ تہہ خانے کے در و دیوار اللہ کے کلام کی تلاوت سے گونج رہے تھے۔

وقت بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ دونوں بار بار اپنی اپنی گھڑیوں میں وقت دیکھتے۔ ڈیڑھ بجے انہوں نے ظہر کی نماز ادا کی پھر وہ سو گئے۔ عصر کے بعد تو وقت جیسے پر لگا کر اڑنے لگا۔ انہوں نے نمک سے روزہ کھولا۔ عشاء پڑھنے کے بعد انہیں بے تابی

ہونے لگی کہ اوپر جائیں۔ مندر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اب اوپر سناٹا ہو گا لیکن منصور کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اسے مندر کے بارے میں کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ پجاریوں کی تعداد کتنی ہے۔ وہ مندر ہی میں موجود رہتے ہیں یا نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ آدھی رات کے بعد کا وقت ہی مناسب رہے گا۔

پھر رات کے بارہ بج گئے۔ ان کے جسموں میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ "اوپر چلیں۔" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ ہم احتیاطاً ایک گھنٹہ اور انتظار کریں گے۔" منصور نے جواب دیا۔

ٹھیک ایک بجے منصور نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے اپنا تمام سامان اوپر پہنچایا۔ رابعہ بھی تہہ خانے سے نکل آئی۔ منصور نے باہر نکلنے کے بعد تہہ خانے کا دروازہ بند کیا۔ اس کے بعد اس نے گھوم پھر کر وہ اہم مقامات منتخب کئے' جہاں آتش گیر مادہ رکھنا تھا۔ وہ خود تعمیراتی انجینئر تھا' اور اس کے لئے ایسے مقامات کا انتخاب کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

"میری مدد کی ضرورت تو نہیں؟" رابعہ نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ کام تو صرف میں ہی کر سکوں گا۔"

"تو میں کچھ نفل ادا کر لوں۔"

"ضرور۔" منصور نے کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

اب اصل مندر میں نماز ادا کی جا رہی تھی۔ اور نماز پڑھنے والی ہستی وہ تھی' جو کبھی مندروں میں بتوں کی پوجا کرتی رہی تھی۔

منصور نے سب سے پہلے مندر کے صدر دروازے کو بوبی ٹریپ کیا۔ اب کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا تو بہت طاقتور دھماکا ہوتا۔ بڑے ہال کی سائیڈ میں بھی ایک دروازہ تھا۔ منصور نے اسے چیک کیا۔ وہ بھی مقفل تھا۔ منصور نے اسے بھی بوبی ٹریپ کر دیا۔ اس کے بعد وہ اصل کام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ہر ستون کے ساتھ آتش گیر مادہ باندھ دیا۔ پھر تمام تار یکجا کر کے اس نے ڈیٹونیشن وائر سے منسلک کر دیئے۔ اب اس کے ہاتھ میں موجود ڈیٹونیٹر ہی ہر چیز کا مرکز و محور تھا۔

ڈیٹونیٹر ہاتھ میں لے کر اس نے ہال کا جائزہ لیا۔ وہ مندر واقعی فنِ تعمیر کا شاہکار تھا۔

اسے خوشی ہوئی کہ وہ اس کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔ "اے اللہ......... اے میرے معبود......... میں تیرا شکر گزار ہوں آقا کہ تُو نے یہ سعادت مجھے نصیب فرمائی۔" اس نے خود کلامی کی۔ پھر وہ رابعہ کی طرف متوجہ ہوا' جس نے ابھی ابھی سلام پھیرا تھا۔ اس نے اشارے سے رابعہ کو اپنے پاس بلایا۔ "دیکھو رابو......... اب مجھے شکرانے کے نفل پڑھنے ہیں۔" اس نے کہا۔ "یہ ڈیٹونیٹر سنبھالو۔ میں نے دونوں دروازوں کو بوبی ٹریپ کر دیا ہے۔ کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش کرے گا تو دروازے دھماکے سے اڑ جائیں گے۔ ایسا ہوتے ہی تم بلاتاخیر ڈیٹونیٹر کا یہ بٹن دبا دینا۔" یہ کہہ کر اس نے رابعہ کی پیشانی چوم لی۔ "سمجھ گئی ہو نا؟"

"تم بے فکر ہو کر نماز پڑھو۔"

وہ ۱۹ مئی ۷۹ء کی صبح تھی اور اس وقت تین بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔

منصور نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ دو نفل ادا کرنے کے بعد مزید دو نفل کی نیت باندھ لی۔ رابعہ ڈیٹونیٹر ہاتھ میں لئے چوکس کھڑی تھی۔

دھماکا ہال کے بغلی دروازے کی طرف ہوا تھا!

مندر کے تمام پجاریوں کے لئے باہر کمرے بنے ہوئے تھے۔ مندر کے بڑے پروہت کا کمرا سب سے بڑا تھا۔ تین بج کر دو منٹ پر بڑے پروہت کی آنکھ کھلی تو اس کا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ سینے میں دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر جاگا تھا۔ چند منٹ وہ یونہی لیٹا خواب یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ گھبراہٹ کا احساس جاگنے کے باوجود بھی بدستور تھا۔

کسی انجانے احساس کے زیر اثر اس نے مندر کے بغلی دروازے کی چابی اٹھائی اور کمرے سے نکل آیا۔ مندر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ بات کیا ہے۔ یہ گھبراہٹ کیسی۔ اسی کیفیت میں اس نے بغلی دروازے کے ہضمی قفل میں چابی ڈال کر گھمائی۔ تالا کھل گیا۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا.........

وہ دھماکا ساعت شکن تھا!

منصور اس وقت دوسری رکعت میں تھا اور دوسرا سجدہ کر رہا تھا۔ دھماکے کی آواز سنتے ہی اس نے سجدہ طویل کر دیا۔ اب نماز پوری کرنے کی مہلت نہیں تھی لیکن یہ

سعادت کم تو نہیں تھی کہ وہ موت کے وقت سجدے کی حالت میں تھا۔ جہاں دروازہ تھا' وہاں اب ایک مہیب خلا نظر آ رہا تھا۔ رابعہ نے پلٹ کر منصور کو دیکھا۔ وہ سجدے میں تھا۔ موت اتنی خوبصورت بھی ہوتی ہے۔ رابعہ نے سوچا اور دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر اس نے بلند آواز میں کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پڑھا' اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ تین بج کر سولہ منٹ ہوئے تھے۔ اس نے ڈیٹونیٹر کا بٹن دبا دیا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر پورے بھارت میں کہرام مچ چکا تھا!

☆======☆======☆

وزیراعظم پاکستان کی سربراہی میں کابینہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ کابینہ کے تمام اراکین منصور صدیقی کا کیسٹ بھی سن چکے تھے اور رام مندر کی تباہی کی خبر بھی۔ بحث کیسٹ پر ہی ہو رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کیسٹ کو عوام کے سامنے لایا جائے یا نہیں۔ وزیر خارجہ کی رائے میں اس کیسٹ کا عوام کے سامنے لانا قومی مفاد کے خلاف تھا۔ کشیدگی بڑھنا تو لازم تھا۔ جنگ بھی ہو سکتی تھی۔

"بابری مسجد کے انہدام پر جنگ نہیں ہوئی تو رام مندر کی تباہی پر جنگ کیوں ہوگی؟" وزیر داخلہ نے اعتراض کیا۔

"کارروائی ایک پاکستانی نے کی ہے۔ بھارت اسے اپنے اندرونی معاملات میں سنگین ترین مداخلت قرار دے گا۔" وزیر خارجہ نے جواب دیا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وزیر دفاع نے کہا۔

"لیکن اس کیسٹ میں بہت بڑا پیغام ہے قوم کے نام۔" وزیر اطلاعات نے کہا۔

"بات یہ بھی ٹھیک ہے۔"

دیر تک بحث ہوتی رہی۔ بالآخر وزیراعظم نے کہا۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کیسٹ کو جوں کا توں ریلیز کرنا مناسب نہیں۔ اس کی تدوین کرنا ہوگی۔ اس کا وہ حصہ کاٹ دیا جائے گا جس میں منصوبے پر گفتگو کی گئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بھارت والوں کو اندازہ بھی ہو کہ کارروائی کیسے ہوئی ہے۔ انہیں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے دو۔ میں نہیں سمجھتا کہ منصور نے کہیں کوئی سراغ چھوڑا ہے۔ اب یہ بھارتی سیکیورٹی ایجنسیوں کے لئے ناسور بنا رہے گا۔ ہاں ہم منصور صدیقی کے خیالات اور اس کا پیغام

ضرور عوام تک پہنچائیں گے۔ لیکن گمنام حیثیت میں......... اس گمنام شہید کی حیثیت میں' جس نے رام مندر کو تباہ کرنے میں اپنی جان قربان کر دی۔"

"لیکن یہ زیادتی ہوگی۔" وزیر محنت نے اعتراض کیا۔

"شہادت خود ایک صلہ ہے۔ منصور صدیقی نے نام و نمود کے لئے یہ کام نہیں کیا۔" وزیراعظم نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم منصور کو ایکسپوز کر کے اس کے بچوں کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ یہ راز منصور شہید کے بچوں کی امانت ہے۔ وہ بڑے ہوں گے تو انہیں ضرور بتایا جائے گا۔"

☆======☆======☆

محمود احمد صاحب کو پاکستان کی شہریت دے دی گئی۔ سرمد صدیقی اور عبداللہ صدیقی کے لئے برسرروزگار ہونے تک معقول وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ ان کے تعلیمی اخراجات بھی حکومت کے ذمے تھے۔ وزیراعظم نے منصور شہید کی چاروں بہنوں کو شرفِ ملاقات بخشا تھا۔ انہوں نے قومی مفادات کے نام پر ان سے اپیل کی تھی کہ وہ ان تمام معاملات کو صیغہ راز میں رکھیں اور سب کو یہی بتائیں کہ منصور اور اس کی بیوی رابعہ فرانس میں ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ انہوں نے منصور کی آخری خواہش کے مطابق دونوں بچوں کو اس کی سب سے چھوٹی بہن نصرت کے سپرد کر دیا۔

نصرت نے دونوں بچوں کو دل سے لگا لیا۔ "منصور......... میرے چھوٹے بھائی۔ تو اپنی ابتدا سے ہی بڑا آدمی تھا۔ تجھے اللہ نے بڑائی دی تھی۔" وہ بڑبڑائی۔

اگلے روز تدوین شدہ کیسٹ ریلیز کر دیا گیا۔

"......... قومی سطح پر بچپنا چھوڑیں اور بلوغت کی طرف قدم بڑھائیں۔ دینی اور ملی حمیت کو جب بھی کسی چیلنج کا سامنا ہو تو سینوں کی آگ کو منفی ردِعمل کے پانی سے نہ بجھائیں۔ سینوں کو روشن رکھیں۔ اندر الاؤ دہکاتے رہیں۔ یہاں تک کہ چیلنج کرنے والے کو بھسم کر دیں.........

"......... شخصیت پرستی سے باز رہیں کہ اللہ نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم ازل سے ابد تک کائنات کے واحد کامل انسان ہیں۔ ان کی سیرتِ طیبہ کو دیکھنے کے بعد کم از کم مسلمانوں کے لئے تو شخصیت پرستی کی

گنجائش ہی نہیں..........

"..........ہم اس یقین کے ساتھ جان دے رہے ہیں کہ بابری مسجد کی جگہ رام مندر اگر ہزار بار تعمیر کیا جائے گا تو ہم ہزار بار اسے تباہ کر دیں گے.........."

اور سب جانتے تھے کہ یہ آواز اس شہید کی ہے جس نے تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود رام مندر کو تباہ کر دیا تھا۔ وہ سب اس کے مقروض تھے اور اس وقت کے منتظر' جب دوبارہ رام مندر تعمیر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

قوم بلوغت کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔

☆======ختم شد======☆